

سیدن

مفتی

رام دین

مضامین رپورتاژ

متاز مفتی

ترتیب

۱۰	اشتار پی اکا اور ادب	۱۵۱	۱۲	رام دین	۵
۱۵۸	سائنس اور ادب	۱۳۷	۱۴	راولپنڈی اور اسلام آباد	۱۶
۱۶۱	اپ کا نام	۱۲	۲۶	عورت کا الیہ	۳
۱۶۹	غصیل دوڑ	۱۵	۳۲	پاکستان	۳
۱۸۳	آپا	۱۶	۶۱	محترمہ ہمیوں پتھی کے نام	۵
۱۹۳	شاہراہِ شم۔ روشن تاثر		۶۰	نماقابل فراموش	۶
۲۰۴	چھڈیاں	۱۷	۸۷	عورت اور جنسیات	۷
۲۳۱	تحاکوٹ	۱۸	۱۰۰	طفیل نیازی	۸
۲۵۲	ڈاسو	۱۹	۱۱۲	جائے پناہ سے جائے امتیاز	۹
۲۶۹	الاچھی نالا	۲۰	۱۳۱	ادب اور ادب	۱۰
	چلاس	۲۱	۱۳۳	کلچر، سینما اور ادب	۱۱

سی ری
کی سما
ٹوٹیلہ
نوئی

کے نام

جنھوں نے مجھے اپنے "ساتھ" سے نوازا۔ اپنا
ساتھی بنانا گوارہ کیا۔

مُمتاز مفتخر

ماج ۱۹۸۶

رام دین

اُجھل ہم پر ایک جزوں سوا ہے۔ کہتے ہیں، ان جزوں کو پاکستان کی آئندیوالی سمجھاؤ۔ بڑی عالمانہ کتبیں لکھی جا رہی ہیں کہ پاکستان کیوں ضرر و وجود میں آیا۔ پاکستان کا مسلک کیا ہے۔ تاریخی پبلو۔ اقتصادی پبلو۔ سیاسی پبلو۔ ہر پبلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

میری دانستہ میں یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ پاکستان کو صرف وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس نے رام دین کو دیکھا ہے۔ سمجھا ہے۔ جانہ ہے۔

میں نے رام دین کو ۱۹۳۷ء میں دھرم سالا کے نواحی دیہات میں دیکھا تھا۔
ان دونوں میں دھرم سالا میں انگلش ٹپھر تھا۔

۱۹۴۸ء میں پہلی جنگِ عظیم کا سانپ نکلا تھا۔ سال بعد تیصیر پر اس کی لکیریں اُبھریں۔ مالی اخبطاط کا چن برتل سے نکلا اور دھواں بن کر بر تیصیر پاک و ہند پر چھا گیا۔ دفتروں میں تخفیف کا کلمہ اڑا چلنے لگا۔ اسامیروں میں تخفیف، تنخواہوں میں تخفیف، گریدوں میں تخفیف۔ تخفیف ہی تخفیف۔

قدیمتی سے میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر اس وقت سندر ٹریننگ کا لمح سے باہر نکلا جب ٹرانزیت حاصل کرنے کے م梗ر راستے مسدود ہو چکے تھے۔

بڑی دوڑ دھوپ کی۔ سفارشیں کروائیں۔ بچھر کمیں تعلیم کے اسپکٹر صاحب نے وعدہ کیا کہ جب کوئی ماسٹر چھٹی پر جائے گا تو عرضی پر لگا دوں گا۔ دہ بھی پچھے گریڈ میں۔

پہلی عرضی مجھے خانیوال میں ملی۔ دوسرا دھرم سالا میں۔ میں جو بٹا لے کا رہنے والا تھا

اول لاہور میں تعلیم حاصل کرتا رہا، مجھے علم نہ تھا کہ پنجاب میں ایسے علاقے جیسی موجود ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ سچی بات توبہ ہے کہ مجھے اقلیت کے مفہوم کا شورہ سی نہ تھا۔ کیسے ہوتا ہے بتائے میں ہندو اقلیت میں تھے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے۔ شادی اور مروت پر مل جمل کر بیٹھتے۔ شادی پر آپس میں بھاجیاں باٹی جاتی تھیں۔

دھرم سالا میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس اقلیت کا یہ عالم تھا کہ سارے سکول میں صرف دو مسلمان طالب علم تھے۔ اور میں واحد مسلمان تھی پر تھا۔

میری مشکل یہ ہے کہ میں پانی پہنست پیتا ہوں، اور بار بار پینتا ہوں۔

رام دین سے میری ملاقات صرف پانی پینے کی وجہ سے ہوئی۔ اگر میں بار بار پانی پینے کا عادی نہ ہوتا تو شاید رام دین کے وجود سے تمہی واقعہ نہ ہوتا۔

ایک روز سکول میں میں نے ایک ہندو لڑکے سے کہا: مجھے ایک گلاس پانی لادو۔ لڑکا میری بات سن کر ادب سے سرخہ کاٹے کھڑا رہا۔ میں نے دوبارہ کہا تو وہ بڑے ادب سے بولا "ماستر جی، میں آپ کو پانی نہیں پلا سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جناب، میرا دھرم بھر شٹ ہو جائے گا۔"

میں ہنس پڑا۔ بولا "برخوردار، دھرم بھر شٹ تو تب ہوتا ہے جب تم میرے بلا تھے کا پانی پیو۔ مجھے پانی پلانے سے تو دھرم بھر شٹ نہیں ہوتا۔"

میری دلیل کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ ادب سے سرخہ کاٹے گوں کا توں کھڑا رہا۔ ان دنوں مجھے یہ شعور نہ تھا کہ دھرم بھر شٹ ایک جذبہ ہے جسے نہ عقل سے تعلق ہے نہ دلیل سے۔ اور ہندو اقلیت کے علاقے میں اس کا مفہوم ادھر سے اور ہندو اکثر بیکھ علاقے میں اور۔

مجھے پتا تھا کہ ہندو مسلمان کے بلا تھے کا پانی نہیں پیتے۔ لیکن پانی پلانے کو تو وہ پُن

سمجھتے تھے۔ یہ ادبات تھی کہ وہ مسلمان سے اپنا یہ تن دُور رکھتے۔ اس دُوری کو قائم رکھنے کے لیے انہوں نے کئی ایک طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ بانش کا ایک مکڑا لیتے۔ اسے کاٹ کر ایک نالی بنایتے۔ اس نالی کے ایک سرے پر وہ اپنی گڑودی سے پانی ڈالتے، دوسرا سرے پر مسلمان اوک سے پانی پیتا۔

ریلوے سٹیشنوں پر گاڑی رکتی تو آوازیں مٹائی دیتیں "ہندو پانی"۔ "مسلمان پانی"۔ ہندو مسافر تو "ہندو پانی" کا انتظار کرتے تھے۔ مسلمان دونوں پانیوں میں کچھ فرق نہ جانتے۔ بے تکلف ہندو پانی پیتے۔ اور پانی پلانے والا جو حکارت بھرا فاصلہ قائم رکھتا، اس سے مطلع بُرا نہ مانتے۔

دھرم سالا میں دھرم بھرست کا یہ نیا مفہوم جان کر میں حیران ہوا۔ یہ بات میری کچھ میں نہ آئی کہ دھرم بھرست کا یہ مفہوم نیا نہیں بلکہ ان علاقوں کا مروجہ مفہوم ہے جہاں ہندو اکثریت میں ہیں۔

اس واقعے سے چند روز بعد مجھے ہندو اکثریت کے علاقے کی دخیلیں نظر آئیں جس کا نام رام دین ہے۔

چھٹی کا دن تھا۔ دھرم سالا کے مناظر تھے۔ میں نے کہا، چلو، گھوم پھر کر دن گزاریں۔ پھاڑوں کی پگ ڈنڈیوں پر گھومتا بھرتا آٹھ دس میں دُور نیکل گیا۔

راستے میں پیاس لگی۔ چشمے تو وہاں جگہ جگہ رس رہے تھے، لیکن پینے سے ڈرتا تھا۔ اس لیے کہ سرکار نے جگہ جگہ بورڈ لگا رکھے تھے:

ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کسی چشمے سے پانی نہ پیں، جب تک وہاں سرکاری بورڈ نہ لگا ہو کہ یہ پانی پینے کے قابل ہے۔

اس احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے کے پانی میں کوئی ایسی دھات پانی جاتی تھی جو گلے میں بیٹھ جاتی اور بالآخر گردن پر گلکٹ نیکل آتا۔

بھر جاں ، پانی کی تلاش میں ایک چھوٹے سے گائیں میں جا پہنچا۔ ایک دکان دار لالہ جی سے پوچھا "جی" یہاں سے پہنچنے کا پانی مل جائے گا؟" لالہ جی نے غور سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بولا "مسلمان ہے؟" میں نے سر اشبات میں ہلا دیا "جی"۔

"لالہ بولا" وہ سامنا گھر مسلمان کا ہے۔ ڈیاں سے پی لو۔" سامنے گھر کے اندر رجھاں کا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تازہ گوبر کی پانی ہو رہی ہے۔ بادر جی خانے میں چوکا بنانا ہوا ہے۔ بالکل جیسے رسولی میں ہوتا ہے۔ کٹوریاں اور تھاںیاں پڑتی ہیں۔ بالکل ایسی جیسے ہندو گھروں میں ہوتی ہیں۔

میں نے سوچا : یہ تو مسلمان کا گھر نہیں ہو سکتا۔ لالہ جی نے شاید کسی اور گھر کی طرف اشارہ کیا ہو۔ اتنے میں اندر سے ایک شخص باہر نکلا۔ بیچے لڑاوی دھونتی۔ اُپر نشکا بدن۔ ٹکے میں جیٹھ۔ سر پر اتنی لمبی گھنی بودی۔

میں نے کہا "حمارا ج، یہاں مسلمان کا کوئی گھر ہے؟"

بولا "لہاں، حمارا ج۔ بی تھے۔ یہ میرا گھر ہے۔"

حیرت سے میرا منځ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

یا اللہ! یہ کیا تماشا ہے! یہ گوبر کا چوکا، یہ جیٹھ، یہ بودی اور مسلمان! "مُمْ سلمان ہر ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی" وہ بولا۔

"کیا نام ہے تھا را؟"

"جی، رام دین یا"

نہ جانے کہتنی دیر میں چھپی آنکھوں سے رام دین کو دیکھتا رہا۔ وہ پہلا دن تھا جب میں نے رام دین کو دیکھا۔

پھر اس علاقے میں گھوستے پھرتے میں نے یہ سیوں رام دین دیکھے اور مجھے احساس ہوا کہ رام دین فرد داد نہیں بلکہ ایک قوم ہے۔ ہندو اکثریت کے علاقے کی تخلیق کردہ قوم۔

اگر پاکستان نہ بنتا تو یہ بات خارج از امکان نہیں کہ آج میں بھی ایک رام دین ہوتا۔ صرف میں ہی نہیں شاید آپ اور ہم سب رام دین ہوتے۔ ہمارے سروں پر چوتیاں نہ ہوتیں، گلے میں جینٹوں نہ ہوتے، گھروں میں گور کی پیائی نہ ہوتی، اس کے باوجود ہم رام دین ہوتے۔ رام دین ایک ذہنیت کا نام ہے جو خود انتیار نہیں کی جاتی بلکہ جسے اکثریت ایک منصوبے کے تحت پیدا کرتی اور بخوبی سے آہستہ آہستہ لیاں گفتگو اور حسبم تک پہنچتی۔ لیکن ٹھریے۔ رام دین پر ہنسنے نہیں۔ اگر رام دین نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ سچی بات یہ ہے کہ رام دین پاکستان کا اولین بانی ہے۔

ہمارے آج کے لفڑاں رام دین سے واقع نہیں، لہذا ان کی سمجھی میں نہیں آتا کہ پاکستان کیوں وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کی آئی ڈیا لو جی کیا ہے۔ میں ان لفڑاں کو مشورہ دوں گا کہ وہ کے ایل گا باکی تصنیف "پیسو دالیسز" پر دھیں۔

اس کتاب میں گما بانے بحاجت کے رام دینوں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے جذباتی باتیں نہیں لیں۔ کسی کو بُرا جھلا نہیں کہا۔ کسی کو موردِ الزام نہیں کھڑرا یا۔

گابا ایک مشہور قائلن دان ہیں۔ پہلے دہ ہندو تھے، پھر مختلف مذاہب کا مطالو کرنے کے بعد مسلمان ہو گئے۔ اس پران کے عزیز فارابی سنن پا ہو گئے۔ ماحول بیری ہو گی۔ انھوں نے گما پر تمام دروازے بند کر دیے۔ ان کے راستے میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ انھیں اس قدر ہر اس کیا کہ نندگی ابھریں کر کے رکھ دی۔ ان کی آپ بیتی ایک طویل دُکھ بھری داستان ہے۔

بہرحال، مسٹر گابا نے اپنی اس تصنیف میں جذباتی باتیں لکھیں، بلکہ

خشنک حقائق بیان کیے ہیں۔ ایسے حالات جن کے مطابق سے پتا چلتا ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کو کس طرح رام دین بنایا جاتا ہے۔

چونکہ مسٹر گاباتاون دان ہیں، اس لیے انہوں نے اپنی تصنیف میں صرف یادیات پیش کیے ہیں۔ مثلاً دفتروں میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے۔ بیرونی مسلمان تاجروں کی اصطکیا ہے۔ کا جوں میں مسلمان طلباء کتنے ہیں۔ شہروں میں چلنے والی لاکھوں موڑگاڑیوں میں سے کتنی مکاریاں ایسی ہیں جن کے مالک مسلمان ہیں۔ ملی میل فن کرنے ہیں مسلمانوں کے پاس کتنے ہیں۔ بھارت نے مسٹر گابا کی اس کتاب کو ہندوں چلنے نہیں دیا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھارتی مسلمان رام دین سے نا اتفاق نہیں۔ بلکہ وہ تو رام دین بیت رہے ہیں۔ اب لیورپ رام دین کے مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ چاہے کوئی جذباتی رنگ میں بیان کرے یا یادیات میں پیش کرے یا منطق کا سما رائے۔ ان کے ذہنوں میں سماجی ترقی کا خانہ ہی خالی ہے۔

عرب ملک عرب اور غیر عرب کے چکر میں پڑے ہیں۔

پاکستان داعملک ہے جسے رام دین سے گہرا تعلق ہے، کیونکہ وہ صرف اسلامیہ موجود میں آیا کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ رام دین بن کر جیئیں۔

دقت یہ ہے کہ وہ لوگ جھنوں نے پاکستان بنانے کے لیے جدوجہد کی تھی، وہ تولد گئے۔ گرانے پتے سوکھ کر جھوڑ گئے۔ ان کی جگہ نئی کونپیں پھوٹی ہیں، جنہیں رام دین کا شکور نہیں۔ کیسے شور ہو؟ پاکستان میں لاکھوں ہندو مذہبیں ہیں۔ ان میں تو کوئی بھی اسلام چندر نہیں۔ پھر وہ رام دین کو کیسے سمجھیں؟

حال ہی میں مجھے سندھ میں تحریک کر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہندوؤں کے گوٹ کے گوٹ آباد ہیں۔ گوبر کی بیاضی ہے۔ چوکے ہیں۔ بُت ہیں۔ پُوچا ہے۔ مندر ہیں۔ آشram ہیں۔ پیپل ہیں۔ سمجھی کچھ ایسے ہے جیسے تقسیم سے پہلے تھا۔

وہی شادی تھی پر میل جوں۔ لینا دینا۔ کھانا کھلانا۔ بھاجیوں کی بانٹ۔ نیوندے۔ سلامیاں۔
مُنْهَدِ کھائیاں۔

تھر کے قبیوں، ہش روں اور گاؤں میں سارا کار و بار ہندو روں کے ہاتھوں میں ہے، جس طرح
تقصیم سے پہلے مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی سارا کار و بار ہندو روں کے ہاتھوں میں تھا۔ مُنڈیوں پر
ہندو براج مان تھے۔ کوئی مسلمان مُنڈی میں جایا تھا تو چند دنوں کے بعد یوں ہاہر نکال دیا جاتا جیسے
دُودھ سے مکھی نکال دی جاتی ہے۔

ہندو قوم ایک عظیم قوم ہے۔ بے شک وہ بڑی خوبیوں کے ماں ہیں۔ لین دین کے کھرے
ہیں۔ توں کے سچے ہیں۔ قول کے کچے ہیں۔ پلی پلی جوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صبر و تحمل، سادگی،
برُد بادی، بے شک ان میں بڑی خوبیاں ہیں۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ ان میں کسی اقلیت کو
برداشت کرنے کی توفیق نہیں اور مسلم کشی کا جذبہ بہت اگرا ہے۔ یہ جذبہ اس حد تک کاملاً شہرتا
ہے کہ نظر نہیں آتا۔ پھر ہمارے لوحجوان بات کو کیسے سمجھیں؟

صرف لوحجوان ہی نہیں، عام مسلمان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہیں سمجھتا۔ دیکھ کر
بھی نہیں سمجھتا۔ بیت کر بھی نہیں سمجھتا۔

ایک تو مسلمان کا خیر ای کچھ ایسا ہے کہ دل خراش حقائق پر نہیں باندھتا۔ بلکہ انھیں
بھلا دیئے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کہ دل خراش حقائق کے یونچے جو جبید چھپا ہے کہیں سمجھیں
نہ آ جائے۔

دُوسرے یہ کہ بدستی سے مسلمان طبعاً اس قدر وسیع القلب ہے کہ دنیوں کے مسلم کوئی
کے منصوبوں جیسی جھوٹی پھوٹی پاٹل کو ماٹنے کرنا اپنی کسرشان سمجھتا ہے۔

غصے میں ضرور آتا ہے۔ بار بار آتا ہے۔ لیکن اس کا غصہ سوڑے کی بوتل کا ابال ہوتا ہے۔
آیا اور گیا۔ غصے کو پلی کر دل میں بھایینے کی خصلت سے عاری ہے۔

تیسروے یہ کہ اسلامی دُنیا کے گرد و پیش بڑی قویں مسلسل کام کر رہی ہیں مسلسل لگ ددد

میں لگی ہیں کہ کمین مسلمان سمجھ رہے جائے۔ مل رہے ہیں۔ یہ جن افتراق و تفرقی کی بروئی سے باہر رہنے کا
آئے۔

یہ وقتیں بڑی طاقتور ہیں۔ بڑی فتال ہیں۔ بڑی سیانی ہیں۔ بڑی دُوربین ہیں۔ انھیں
پتا ہے کہ مسلمان سمجھ گیا، مل بیٹھا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔ ان کا طریقہ کار بڑا منفرد ہے۔ پڑاڑ
ہے۔ وہ اپنی فکرداریوں میں چکیلے خیالات، جاذب نظر نظریات اور پکش، انہی ذہنی چھکھڑیاں
بناتے ہیں، ایسی جو ہمارے ادبیوں، شاعریوں، فن کاروں اور دانش دروں کو چکا چوند کر دیں۔ اور پھر
انھیں ہمارے لکھوں میں مجھ دیتے ہیں۔ ان ذہنی چھکھڑیوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے
ذہنوں کو سورکر دیں۔ تاکہ مسلمانوں کا رُخِ اسلام کی طرف رہ ہو جائے۔ فروعات میں ہی چھنسا ہے۔
وہ جانتے ہیں کہ ادیب فنکار اور دانش و راوی پیشین میکر زہوتے ہیں، جو خیالات کی دنیا میں
نشے فیشن چلاتے ہیں۔ اس سے ان کا رُخ بگاڑنے سے عام پڑھنے لکھوں کا رُخ خود بخوبی جلا جائے گا۔
دانش دروں کے علاوہ یہ وقتیں طلباء پرا اثر انداز ہوتی ہیں، جو معصوم ہوتے ہیں اور نئی چیزوں کے
متلاشی، جن کی ہندیا میں اُبال لانا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

پھر ایک تیسرا گروہ ہے جنہیں یہ وقتیں کام میں لاتی ہیں۔ یہ گروہ مذہبی دلیوالوں کا ہے۔
ایک تو یہ گروہ بہت پڑاڑ ہے، دوسرا سے ان کا اپنا مسلک بھی ہیں ہے کہ مسلمان فروعات میں
چھنسا ہے۔ اصل کی طرف لو جنم کرے۔ اتنا چھنسا ہے کہ بات سمجھنے کی تملت نہ ملے۔

میرے ایک دوست یورپ میں چند سال مقیم رہنے کے بعد وطن لوٹے تو انہوں نے
مجھے بتایا کہ وہ ایسی ۲۴ تنظیموں سے واقع ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان سمجھ رہے جائے۔ اس
مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان تنظیموں نے بہت سے حربے چلا رکھے ہیں۔ مثلاً:

- (۱) مادرین دُنیا میں اسلام کے خلاف تحریر کی دھاکندہ ہونے پائے۔
- (۲) ایسی صورت حالات پیدا کی جائے اور اسے قائم رکھا جائے کہ نوجوان مسلمان اپنے
مذہبی جذبے پر شرمساری محسوس کریں۔

(۳) ایسی صورتِ حالات پیدا کی جائے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا نہ ہو۔

(۴) سیکھ ناظر کو اپھالا جائے۔ جمورویت کے گن گائے جائیں۔

میرے درست نے بتایا کہ ان تسلیموں میں چند ایک ایسی بھی ہیں جن کا سالانہ بحث پاکستان کے بحث سے کئی گناہ یاد ہے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی بدسمی یہ ہے کہ مساوات ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جذبہ مساوات میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ دل میں تعصیت پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اس کے بعد اس زندگی میں اپنے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ انسان چند ایک مشین تعصیبات پیدا کرنے۔ مثلاً اپنے دین کے حق میں تعصیت، اپنے دلن کے حق میں تعصیت، اپنے آباء و اجداد کے حق میں تعصیت۔ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دین پر فخر کرے۔ اپنے دلن پر فخر کرے۔ قوم پر فخر کرے۔ خاندان پر فخر کرے۔

دشمن اسلام ہمیشہ اس بات سے خلاف رہے کہ کہیں مسلمان اپنے دین پر فخر کرنا نہ سمجھے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے انہوں نے ایسے خیالات فضا میں چھوڑ دیے جو دین اور دلن کی نفع کرتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے یہ پرچار کرنا شروع کر دیا کہ مہذب آدمی وہ ہے جو انسنی پیشہ ہو۔ جو تعصیبات سے پاک ہو۔ جسے ز دین کا الحافظ ہو ز دلن کا۔ جس کا نقطہ نظر خاہی ہو۔ آج سمجھیٹو ہو۔ جذبات سے آکر دن ہو۔ سیکھو ہو۔ یعنی جو مذہب کا دلوانہ نہ ہو۔ دلن کا غلام نہ ہو۔ آج کا مسلمان نوجوان مغرب کے چینگل میں بھنسا ہے۔ وہ اس کو شش میں لگا ہے کہ مذہب سمجھا جائے۔ اس حد تک سیکھ بننے کی کوشش کر رہا ہے کہ دل کی گمراہی میں رچے بے دینی جذبے کو تسلیم کرنے سے منکرے۔ وہ دلن کی محبت کو ایک منفی بعض سمجھنے لگا ہے، اور اپنے دین پر نا دام ہے۔

ڈاکٹر عفت سے ایک غیر ملکی کرمل نے پوچھا "آپ کے مذہب میں سوڑکانایکوں حرام ہے؟"

ڈاکٹر عفت نے کہا "یہ ایک حکم ہے۔ میرا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ کرمل صاحب، حکم

کی دھرم جاننا ضروری نہیں۔ اسے مانتا ضروری ہے۔"

کرنل ہنسا۔ بولا "جس حکم کو آپ سمجھتی نہیں اس پر عمل کرنے کا مقصد چاہیے؟"

ڈاکٹر عفت ہنسیں۔ بولیں "حیرت ہے، کرنل صاحب کر آپ فوجی افسر ہوتے

ہوئے حکم کے مضموم سے واقف نہیں۔" کرنل کھسیانا ہو گیا۔

عفت بولیں "کرنل صاحب، ہر کلب کے اصول ہوتے ہیں جن کی پابندی لازم ہوتی

ہے۔ مذہب بھی ایک کلب ہے۔ یا تو آپ کلب کے ممبر نہیں یا انہیں۔ یہ آپ کی مرغی پر

موقوت ہے۔ لیکن مکن بن جائیں تو پھر چون وچار کی گنجائش نہیں رہتی یہ۔"

ہماری مشکل یہ ہے کہ مغرب کے زیر اثر ہم عقل کے اس قدر دلوانے بننے بیٹھے ہیں کہ کچھ حد نہیں۔ حالانکہ ہر فرد جسے تھوڑی سی سُوچ بیجھ بھی حاصل ہے، اس حقیقت کو جانتا ہے کہ زندگی میں بہت کم باقی ایسی ہیں جن پر عقل حادی ہے، اور بہت زیادہ باقی ایسی ہیں جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ عقل کو ہم نے بُت بنار کھا ہے، اس حلشک کریمانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، ہم عقل کے میعادار کو اللہ تعالیٰ پر بھی عائد کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

ہم سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کیوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے یہ پچھے ضرور کوئی ایسی حکمت ہوگی جو ہم عقل کے زور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس یہ ہم اس کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اور اگر کامیاب نہ ہوں تو حکم پر شک کرنے لگتے ہیں۔

خیر یہ توجہ معتبر ہے تھا۔

میں دین اور دلکش کے لیے مثبت تھیات کی بات کر رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندو قوم بھیثیت قوم ہم سے بہتر ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے دھرم اور دلیش کے لیے تھیات پال رکھے ہیں۔ ان کے دلوں میں جذبہ انتقام ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اور جس قوم میں انتقام کا جذبہ نہیں دہ قوم قیام سے محروم رہتی ہے۔

تھیس کے دقت جو کچھ مسلمانوں پر بیتا تھا، وہ اگر ہم یاد رکھتے تو رہتی دنیا تک

جنہیہ انتقام ہم میں شلگا رہتا۔ لیکن ہم اسے نہ جوول گئے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد رکھنا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہندو اس بات کو نہیں بخواہ کر ان کے نکاں کا بٹوارہ کر دیا گیا ہے۔ وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ آپ اسے جو بھی چاہے بھیں، میں اسے ہندو قوم کی عذالت کی دلیل سمجھتا ہوں۔

گزشتہ تیس برس میں، ایک اندازے کے مطابق، بھارت میں بیس ہزار ہندو مسلم فساد آور ہے ہیں۔ اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم اس بات پر خیز محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں ایک بھی فساد نہیں ہوا۔

مطلوب یہ ہے کہ ہم اپنے بھارتی بھائیوں سے کہتے ہیں : دستوابے شکن مسلمانوں کے خون سے ہوئی کھیلو۔ ہم مذکوب لوگ ہیں۔ ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل میلانہیں کرتے۔ الحمد للہ کہ ہم مُنتقمِ مزاج نہیں ہیں۔

گزشتہ صدیوں میں بھارت میں جس نئے مذہب نے سراہما، ہندوؤں نے اسے بڑی سُوچھ لبجھ سے ہندو دمت میں جذب کر لیا۔ بدھ ازم ایک عظیم مذہب تھا جس کے اصول ہندو دمت سے مختلف یا کم متفاہد تھے۔ ہندوؤں نے بدھ ازم کو گلے لگایا، اس کا مٹھ پُچھا، گود میں بھایا اور بالآخر اس کے سر پر چوپی رکھوادی، ماٹھ پر ٹیکا لگا دیا۔ حتیٰ کہ وہ ہندو دمت کے زنگ میں رنگا گیا۔ جیسی مدت بھی یونہی ہندو دمت میں جذب ہو کر رہ گیا۔ پھر سکھ ازم تھا جو ایک طائفہ رہ گیا۔ جیسا کہ مذہب تھا، جو ہندو دمت کے مزاج سے یکسر مختلف تھا۔ لیکن ہندوؤں نے اسے جی رام کر لیا۔

لیکن اسلام ایک ایسا کوکڑ و نکلا جو صدیوں کی آنچ کے باوجود ہندو دمت کی دیگ میں گل نہ سکا۔

بے چارہ ہندو حیران ہے۔ ہے رام! یہ مسلمان کیا شے ہے جو کسی طور رام نہیں ہوتا۔ اچھا، یوں قابوں نہیں آتا تو دوں سی۔ ذرا فرنگی کو جالینے دو۔ پھر دیکھ لیں گے۔ فی الحال ایک

ادر دا ڈچلا دیکھو ۔

ہندو نے خود کو مور کے پر لگایا ہے اور اعلان کر دیا کہ ہم ہندو نہیں، کاٹگری ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر سیکولر ہے۔ ہمارا مقصود شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلاتا ہے۔ پھر جب یہ حریم بھی نہ چلا اور پاکستان دبجو دیں آگیا تو ہندو کا جذبہ انتقام ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ اور بھر ٹکا اور اس کی سیاست اکھنڈ بھارت پر مرکوز ہو گئی ۔

اگر آج تک ہم بھارت کی دست بُرد سے بچے ہوئے ہیں تو میری دانست میں اس کی دو وجہیں ہیں :

ایک تو ہمارے عوام میں مثبت جذبہ موجود ہے، اور دوسرے ایسا لگتا ہے جیسے پاکستان کو تائید ایزدی حاصل ہے ۔

راولپنڈی اور اسلام آباد پونھوبار کے دو جڑوں وال شہر

مارکل پہاڑیوں کے دامن میں بخارا کی دوسرے کے قریب لیکن دراصل ایک دوسرے سے بہت دور کو دو شہر باقاعدہ ہیں۔
دوں میں کوئی مناسبت نہیں۔

ایک شلوار پھیلائے، دستار سجائے، بلاخ میں بھڑکی پکڑے کھڑا ہے۔ دوسرا مارڈ کا رنگانے، "کو" سمجھائے ہمیٹ لگائے کھڑا ہے۔
ایک رشتوں کی دلمل میں اس پت شور و شغب کا متواala، بھڑکی طرح جذبات کی شدت سے جھن جھن کرتا ہے۔ دوسرا رشتوں سے بے نیاز، خاموش، متوازن، کسے رابا کسے کام سے نہ باشد کا متواala۔

ایک دل ہی دل ہے، دوسرا مغز ہی مخز
ایک "اساں" ہی "اساں"، دوسرا میں ہی میں
ایک میلا میلا آوارہ منش عاشق مراج
دوسرا اجلاء اجلاء، محبویت سے سرشار
ایک اصل ہی اصل، دوسرا نقل ہی نقل
ایک قریم، دوسرا جدید

دونوں شہروں میں صرف ایک بات مشترک ہے کہ وہ پوٹھوہار میں واقع ہیں۔
بیانی طور پر پوٹھوہار ایک گلی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھری ہوئی گلی۔ یہ گلی گزگاہ
کا کام دیتی ہے۔ یہی سمجھ لیجیے کہ یہ صیفی کی عالی شان ماٹی کی ڈیلوڑی ہے۔

قدیمتی سے یہ گزگاہ گلی بڑی ہری بھری تھی۔ جاذب نظر تھی۔ ہر گزرنے والا اسے دیکھ کر داہ
کئے پس جو رہ جاتا اور پھر گزگاہ کی بجائے لوگ جاتا۔ مستانے کا نیصل کر لیتا۔ اس کی جاذبیت
صرف سرسری کی وجہ سے نہیں تھی۔ ایک تو نظر کا حسن، درسے ٹھنڈے اور شیریں چشمی، دروں سے نہیں
والی خنک ہوا گلی بُٹے اور چپل۔

بس اس ایک بات کی وجہ سے پوٹھوہاریوں کے یہ مشکلات پیدا ہو گئیں۔

طرح طرح کے لوگ اس گلی سے گزرتے رہے: حملہ اور، صوفیائے کلام، سیاح، طالع آنما
اور طلب علم کے مارے ہوئے۔ ایک دریں اس علاقے میں کئی ایک معروف درس گاہیں قائم تھیں،
جمانِ دینیوی اور دینی دونوں طرح کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔

اس گلی میں آمد رفت کی گہاگنی گئی رہی، جو یہاں کے باسیوں کے لیے افرانگی کا باعث
بن گئی۔ ذاتی تحفظ کا مسئلہ ہمیشہ درپیش رہا۔ لوگ طبعاً جنگجو بن گئے پھر اپس میں لڑائیاں چھیڑلیں۔

خونخ بال کی کھال اگارتے کے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ اب تک اس گلی کے طول و عرض پر
چلکر رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، یہ رہا داری یہاں سے دہل سکت تھی۔ کوئی کہتا ہے، ہنیں، یہ راہداری
تو دہل سے یہاں سکت تھی۔

پھر اس کے نام کے بارے میں بھی کئی روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ پہلے یہ علاقو
بے نام تھا۔ ایک مرتبہ شمشاد جانگر ادھر آنکلا۔ کہنے لگا: یہ علاقہ تو اونٹ کی پیٹھ جیسا ہے۔ کہیں
اوچان کہیں پچان کہیں کوہاں۔ اس پر اس علاقے کا نام ”پیٹھ ہارا“ پڑگیا۔ یعنی پیٹھ جیسا جو بعد میں بگڑ کر
پوٹھوہار ہو گیا۔

آج بھی اس ماہداری میں کئی ایک مقام ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار بخوبی سے واہ نہ کل جاتی۔

ہے۔ حسن ابدال پھر اڑیوں سے گھر اس سبز پیالہ ہے۔ باغات اور حشموں کا شکم داہت ہے۔ اس علاتے میں چھوٹے چھوٹے صحرابھی تھے۔ مثلاً ہنگامہ سلا کا نام پہلے صورتے کا لاحقا۔ ان ریگ نازروں میں ایک جگہ تھی جہاں ایک ہندو راول نے ایک آبادی قائم کی اور اس کا نام پنڈی رکھا۔ مطلب ہے چھوٹا گاؤں۔

یہ چھوٹا گاؤں آہستہ آہستہ ایک آٹا بن گیا۔ کبیکہ یہاں سے کشمیر کو سڑک جاتی تھی۔ گھوڑوں کا آٹا۔ یکوں کا آٹا۔ بار بردواری کے جانوروں کا آٹا۔ یہاں سے تانگے سر نگر جاتے تھے۔ راستے میں جگ جگ پڑاڑ آتے جہاں گھوڑے اور گاڑی بان بدل جاتے۔ یعنی پنڈی کی واحد اہمیت مواصلاتی تھی۔

پھر انگریز نے دیکھا کہ یہ جگہ چھاؤنی کے لیے منزوں ہے۔ انھوں نے شرکے پاس چھاؤنی بنادی۔ چھاؤنی میں بیرے خانے اور خلیگاں اگئے پھر سٹھوں نے تجارتی امکانات کو دیکھ کر یہاں بودو باش اختیار کر لی۔

پنڈی کی تین باتیں مشورہ ہیں : زمین ہوا رہتیں۔ درخت چھلدا رہتیں۔ موسم کا اعتیار رہتیں۔ موسم کے لحاظ سے پنڈی ایک خالون ہے۔ لیکن سے نہیں کہا جاسکتا کہ محترمہ کب مسکرانا چھوڑ کر گھوڑا شروع کر دیں۔ اگر جوں میں اوسے پڑنے لگیں یاد سبھ میں سن سڑک ہو جائے تو باعث تجویز نہ ہوگا پنڈی میں مستقل رہائش اختیار کرو تو دو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک پیٹ پھول جاتا ہے، باڑگوڑ گھومنے لگتا ہے۔ دوسرے قبل از وقت بال سفید ہو جاتے ہیں، بھڑنے لگتے ہیں اور پنجے ٹانٹ نکل آتی ہے۔

چھوٹے ہوئے پیٹ اور جکپی ہوئی ٹانٹ کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ شکل و صورت سے اپنے معتبر نظر آنے لگتے ہیں۔ اگرچہ یہ معتبری اور پرکی اور پرکی ہوتی ہے۔ پھر بھی معتبری تو ہوتی ہے۔ اور وہ بھی مفت کی۔

پتا نہیں کیوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں کے مقامی لوگ معتبر نظر آنے کے بڑے متواتے ہیں۔ چاہے وہ اُپر اُپر کی ہو یا جھیٹ کی۔ وہ رکھاڑ کے دلدادہ ہیں اور معتبری رکھ رکھاڑ میں بڑی مدد معاون رہتے ہے۔ برعکس، یہ خصوصیت یہاں کی آب دہوا کا تحفہ ہے۔

ہر اتویں کی بڑی عمدہ ہے نہ اس میں دھواں ہوتا ہے اور نہ کارخانوں کی پیدا کردہ آلات۔

چونکہ پہاڑیوں سے آتی ہے اور پہاڑیاں چیل کے درختوں سے چھان کر ٹھیک ہیں لہذا تازہ ہوتی ہے، پاکیزہ ہوتی ہے۔

راولپنڈی کا پانی بہت پتلا اور خشک ہے۔ اطباء کا کہنا ہے کہ یہ پانی شورہ ہی شورہ ہے۔ اس میں بوئیاں نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے معدے میں جا کر شور شراب پیدا کرتا ہے۔

پندرہ بیس سال پہلے یہاں دونوں پانی دستیاب تھے۔ شورے والا الجھی، بوئیں والا الجھی اور یہ پنڈیوں کی مرغی پرستوقوف مختار چاہیں تو شورے والا الجھی، چاہیں تو بوئیں والا۔

اُن دونوں پہاڑیوں کی جانب سے بہت سے نالے پنڈی کی طرف بہتے تھے۔ ان میں برساتی بھی تھے اور جھنپٹے بھی۔ چھبوٹ کا پانی نہ شور تھا اور نہ خشک۔ اس میں دھا تیل تھیں۔ پتا نہیں کیا تھا۔ بوئیاں ہی بوئیاں۔ ہم نے ترقی کے جذبے کے تحت جلد بانی کی اور سارے نالے اور جھنپٹے راول ڈیم میں ڈال دیے۔

پنڈی کی مٹی میں کپڑے نہیں۔ قیام نہیں۔ بڑی بھرپوری ہے۔ جیسے نوجوان کی بیسویں ہوتی ہے ذرا سا پانی چلے تو یہاں کی مٹی اس کی انگلی پکڑ کر چل پڑتی ہے۔ اتنی ہر جائی ہے کہ بارش کا ہر قطرہ اسے انگلی لگائے چھرتا ہے۔

مٹی کی اس خصوصیت کی وجہ سے جیا لوچی کے ماہر برٹے فکر مندیں۔ انھیں خوف دہن گیر ہے کہ اگر پہاڑیاں یونہی شدت سے بتا شے کی طرح گھلی گئیں تو جلد ہی پہاڑیاں سپاٹ میدان بن جائیں گی۔ صرف چند لاکھ ہزار برس میں۔

پنڈی کی مٹی کی اس خصیت نے بلدیہ کو زریق کر رکھا ہے۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں بیٹھ جاتی ہیں، پل نشگہ ہو جاتے ہیں اور باغیچوں کی سجادوں ختم ہو جاتی ہے۔

اسی وجہ سے پنڈی کے مردوں کی کیفیت بڑی تکمیل دہے۔ مٹی میں کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے یہاں لحمد والی قبر نہیں بن سکتی۔ سلاجی دالی قبر نہیں ہے۔ مردے کی پچھے نڈادیتے ہیں۔ اور پرستھوں کی سیلں رکھ کر

بکس بنا دیتے میں۔ سپلی ہی بارش میں اطراف کی مٹی گھل جاتی ہے اور سلیں یونچے گر پڑتی ہیں۔ سل چوڑیں
کا خدا جھلا کرے، دریہ روزِ قیامت تک مردوں کی چھاتیں پر پھر کی سلوں کا بوجھ پڑا سے۔
پنڈی کے رہنے والے شاید اسی مٹی سے بنے ہیں، اس لیے ان کی طبیعت بھی بھرپوری ہے۔
اس میں استحکام نہیں۔ جذبے کی لمراحتی ہے اور ان کی الگی پکڑ کر ساختہ ساختہ لیے پھرتی ہے۔
جذبات ہری ان کا اوڑھنا پھونا ہے۔ تیم ان کا پھر نہیں بلکہ اسکی۔ تہذیب نو اخیں اپنے
رنگ میں رنگ نہیں سکی۔

پانی کے شور سے کی وجہ سے پنڈیوں کی طبیعت میں شور اشموری ہے۔ پیار میں شدت، غصے
میں شدت، لغت میں شدت۔ دوست بن جائیں تو ان من دھن سے بنیں گے۔ مدد کرنے پر تو
جائیں تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ انتقام لینے کی ٹھان لیں تو یہ جذبہ پشت در پشت پلے گا۔
پنڈی یئے نام کے راجے نہیں، مزاج کے راجے ہیں۔ رکھ رکھاڑ پر جان دیتے ہیں۔ لگھ ہیں
کھانے کو ہو رہے ہو جمان بچ کر رہے جائے۔ یوں نوازیں گے جیسے حاتم شانی ہوں۔ دوست مشکل میں پڑ جائے تو
اس بات کا انتفار نہیں کریں گے کہ وہ مدد کے لیے پکارے، یوں چھاتی مٹونک کر باہر نکلیں گے جیسے
اپنے زملے کے واحد مشکل کشا ہوں۔

چاہے زندگی حرام ہو جائے، چاہے سارا دھن لٹ جائے، چاہے جان سے جانا پڑے
لیکن عزت پر حرف نہ آئے۔ برادری میں سر اُد سخار ہے۔ موچھ اکڑی رہے۔ طرہ لمرا تاہے۔
پنڈیوں کا سب سے بڑا جذبہ لگھ کی عزت ہے۔ اگر لگھ کی عزت ایک ہزار روپیہ ماہوار
خرچنے سے قائم ہو سکتی ہے تو وہ ایک ہزار روپیہ کمائے کے لیے تن من کی بازی لگادیں گے لیکن
ایک ہزار کمائے کے بعد اطمینان سے باختہ پر لا تھہ دھر کر بیٹھ جائیں گے۔ گیارہ سو کمائے پر کسی صورت
تیار نہ ہوں گے۔ ”ہٹاؤ کوں مشقت میں پڑے“

جب لگھ کی عزت کا انتظام ہو جاتا ہے تو ان کے اندر کا محنت کش معدوم ہو جاتا ہے اور
راجا باہر لکل آتا ہے۔ تحنت پر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنے طرے کو مادا لگالیتہ ہے اور موچھ مر ڈنے لکتا ہے۔

پنڈیتے خوش باش لوگ ہیں۔ انھیں کھانے سے دلچسپی ہے کھلانے سے دلچسپی ہے۔ ملنے لانے سے دلچسپی ہے۔ محفل سجائے سے دلچسپی ہے۔ تکمیل تاشے سے دلچسپی ہے۔ خدمانی جھگڑوں کی لوت لگی ہے۔ درستیاں بھی بہت اور شمندراں بھی بہت۔ روایات کوئینے سے لگائے پھر تے ہیں۔ اپنی بولی بولتے ہیں۔ اپنا باب اپننتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے رسم و رواج پر شرما نہیں، اُنہاں خونگزرتے ہیں۔

پنڈیتے کھانا نہیں کے بہت شوقیں ہیں۔ زندہ ناج گانا ہو تو کیا بات ہے۔ دویں دینے کی رسم عمل نکلے تو اپنے رہنگ میں آ جاتے ہیں۔ بچھر چاہے گانے والا ہو یا والی۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بس ہیں دوں سوار ہو جاتی ہے کہ دویں دینے میں کسی سے پچھے نہ رہ جائیں۔

پُرانے زمانے میں پنڈیت ایک قصیدہ تھا جس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ ایک طرف ”رتنہ“ تھا دوسرا طرف ”مریڑی“ تھا اس سے پسے ”جھنڈا“ اور ”دُور“ ”ڈھیری“۔

اس زمانے میں پنڈیتی شہریں سب سے اہم ملگر راجا بانڑا تھی جہاں راجے مو پھر مروڑے، طوہ لہراتے گھوستے پھرتے تھے۔ اس بانڑا میں کھلنے پڑنے کی دکانیں عام تھیں جہاں بڑے بڑے کھاٹ اور سخت پچھے رہتے جن پر بیٹھ کر قوہ پیا جاتا، گوشت کے چپل اور سیخ بباب بوش کیے جاتے۔

دوسرا اہم جگہ ایک سڑک تھی جسے مری روڈ کہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ شہر پھیلیا گیا۔ گرد و نواح کے گاؤں شہر کے محلے بن گئے۔ مری روڈ پر تانگوں کے ساتھ ساتھ بسیں چلنے لگیں۔

بھر پاکستان کے قیام کے بعد دفتار امری کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس سے پہلے مری ایک ہل ایشیان ضرور تھا لیکن صحت افزا مقام نہ تھا، کیونکہ بہت گیلا تھا، بارشیں زیادہ ہوتی تھیں، ہوانی سے بھری رہتی تھی۔

قصیہ سے پہلے بڑے صنیف میں بہت سے ہل ایشیان بھتے جو ہل ایشیان ہونے کے علاوہ صحت افزا مقام بھی تھے۔ لہذا ہل ایشیان میں مری کی حیثیت شودھرانی کی سی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد دفتار ای شودھرانی باہمی بن گئی۔ چونکہ مری داحدہ ہل ایشیان تھا جو ہمارے حصے میں آیا تھا لہذا امری کی اہمیت

بڑھ گئی۔ ساختہ پنڈی کی حیثیت بھی بڑھی۔

پاکستان کے لیے مری ایک "ہالیڈے ریز ارٹ" بن گیا۔ لوگ ڈور ڈور سے آنے لگے بھر آہستہ آہستہ مری کی ماں روڈ پریش پر ٹیڈ ہونے لگی جو آج تک باری و ساری ہے۔ مگر اس پر ٹیڈ میں کبھی کسی مقامی خاتون نے شرکت نہیں کی۔ مقامی آبادی اس پر ٹیڈ کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ یہ پٹھو ہاری خاتون کی عنصرت کی ذمیں ہے۔

عام طور سے ایسے علاقے جہاں "ہالیڈے میکرز" کا اجتماع ہوتا ہے، ہالیڈے میکرز رج بس جاتے ہیں اور عیاشی کی فضائی پیسٹ میں آکر ان کے اخلاقی گر جاتے ہیں لیکن مری کے لوگوں نے آج تک اس ہالیڈے سے اپرٹ کے ائم کو قبول نہیں کیا۔

عام طور پر یہ اصول ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں رہنے والی خواتین جنسی لحاظ سے گرم ہوتی ہیں اور ان میں ضبط کے عفر کا فتقان ہوتا ہے۔ مثلاً کانگڑہ ہے، چھبہ ہے، شلکے کے زیریں علاتے ہیں۔ لیکن پٹھو ہارا در آزاد کشمیر اس اصول سے مستثنے ایں۔ غالباً اس لیے کہ ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کی خوشبو ہے اور وہ عزت کو سب سے بڑا وصف سمجھتے ہیں۔

نقیم کے بعد بھارت نے کشمیر کو تھایا جس کی وجہ سے کشمیر کا راستہ بند ہو گیا۔ تجارتی نقطہ نظر سے یہ پنڈی پر بہت بڑی ضرب ہتی۔ اس ضرب تک پنڈی کی ترقی رُک گئی اور یہ شرکی سال تک بیٹھا اونگھتا رہا۔

پھر دفنتہ پٹھو ہار میں ایک بھروسہ نجاں آگیا۔

حدسہ ایوب نے پٹھو ہار میں اسلام آباد کو پاکستان کا دارالخلافہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس پر صاحبوں افسروں اور کلرکوں کی اپسیش گاٹریاں دھڑا دھڑ پنڈی پہنخنے لگیں۔ چک لالہ کی بارکیں اور پنڈی کے مضافات لوگوں سے کچھا کچھ بھر گئے۔

پھر پنڈی کے شمال میں مرگلہ پہاڑیوں کے قریب اسلام آباد نے سراٹھیا ہمزی طرز کے خوبصورت بنگلے، فلیٹس، کوارٹر، مارکیٹیں، ہمار مغلی کا پرپٹ سڑکیں، عجیب و غریب وضع کے

عالی شان دفتر، انوکھی وضن کے روایت سے ہست کم مسجدیں اور چاروں طرف درخت ہی در بولٹے ہی بولٹے۔ ایسے درخت اور بولٹے جو پاکستان میں کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے۔
اسلام آباد کا شہر اک مجهدہ بن کر رونما ہوا۔

نور پور اور سید پور کے درمیان کا دہ زیریں علاقہ جہاں اسلام آباد تعمیر ہوا ہے، ایک سینگر دیرانہ تھا جہاں کلڑ زدہ نہیں اور خادار جھارلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ کھڑکی و جو سے یہاں کچھ اُگ نہیں سکتا۔ اس خطے میں کر لے سانپ رہتے تھے۔ بڑے بڑے کر لے تھے۔ نیوے تھے۔ اس علاقے میں دو رین جلیسی پتلی سڑکیں بنی ہوئی تھیں جو پنڈی سے نور پور اور سید پور جاتی تھیں۔ یہاں حشرات الارمن کی وجہ سے لوگ پیدل چلنے سے گیر کرتے تھے۔ اس علاقے میں آج ایک خوبصورت شہر، چھوٹوں سے مزین ترکیں اور باغات اور لاکھوں درخت دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اسلام آباد ایک مہبہ ہے۔ واقعی سماں میں کام قابل تعلیم ہے۔
اس شہر کی سب سے بڑی خاتی یہ ہے کہ نام کے سوا اس میں نہ اسلامی رنگ ہے نہ پاکستانی رنگ۔

درحقیقت اسلام آباد ابھی تک شہر نہیں بنا۔ اس میں عوامی رنگ پیدا نہیں ہوا۔ ابھی تک یہ شہر مغرب نہہ اہل کاروں کی ایک کاروں ہے۔ یہاں فانلوں کی باتیں ہیں۔ گریڈوں کے تذکرے ہوتے ہیں۔ دفتری سیاست کی سرگوشیاں اور سیٹیشن کی ذات پات ران گئے۔ یہاں پاکستانی کچھ ڈھانٹاںگ روزمری میں سجاوٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اہل کاروں کے بیٹے بیٹیاں مغربی دھنون پر اپنے ڈنڈ ناج ناچتے ہیں۔ اسلام علیکم کی جگہ ہائی اور خدا حافظ کی جگہ بانی کہتے ہیں۔

اسلام آباد کے قیام کے بعد پنڈی کی کایا پٹی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مری رود گوریانی سے دریا بن گئی۔ اتنی فراخ ہو گئی کہ ڈیل روفیں گئی۔ ویگنیں دونوں شہروں کے درمیان یوں پلنے لگیں جیسے وال کلک کا پنڈوں لم چلتا ہے۔ سڑک کے کنارے مارکیٹیں اور اسٹور بن گئے۔ دونوں شہروں کے درمیان ویران علاقہ آبادیوں میں بدل گیا۔

آج آنہ آباد ایک انٹرنیشنل شہر کی جیشیت اختیار کر چکا ہے۔

آج پنڈتی ایک اونچھا ہوا شہر نہیں، ایک چاق و چوبیدر دبر ترقی سمنی بن رہا ہے۔ پنڈتی یہ اپنے ارد گرد نظر ڈالتے ہیں تو خوشی سے بچھوئے نہیں سملاتے۔ البتہ صاحبیت کے چڑھتے ہوئے طوفان کو دیکھ کر سمجھنے نظر آتے ہیں۔ پنڈتی کو دور بدارید کی ترقی کی لبیٹی میں دیکھ کر گھبرا شے ہوئے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں خائف ہیں کہ میں ترقی کی رو میں ہن لکھنے سے روایت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ نہ فدا شے۔

انھیں اپنے رہن سہن اور لوک درثی سے اتنا لگاؤ ہے کہ اس کے لیے زندگی کا تصویر ہی نہیں کر سکتے۔

پوچھو ہاریئے جو سالہ ما سال مری کی فیشن پر یہ کو دُور سے دیکھتے رہے، دامن تر مکن ہشیار باش کی نظر سے دیکھتے رہے، لگانِ غالب ہے کہ وہ صاحبیت کی اس بیماری سے متاثر نہیں ہوں گے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل بعید میں ایک روز پنڈتی سے اسلام آباد پر یادگار کر کے اسے شہر نادیں اور اس شہر پر پوچھو ہار کا رنگ چڑھا دیں۔

پہلے پنڈتی سے اسلام آباد کو پنڈتی کا ایک مضاف سمجھتے تھے لیکن اب وہ پنڈتی کو اسلام آباد کا ایک محلہ سمجھنے لگے ہیں۔ اسلام آباد پر وہ فخرِ محبوس کرنے لگے ہیں۔ شاید اس لیے کہ پوچھو ہار کے معروف بزرگ امام شاہ بربی طیف نے ڈھانی سوسال پہلے فرمایا تھا کہ فروپور کے گرد و نواح میں ایک شہر آباد ہو گا جو اسلامی دُنیا کا مرکز بنے گا۔

کاش کہ اسلام آباد کے معماروں کو شاہ بربی طیف کی عقلت کا احساس ہوتا اور وہ ان کے رو ضمہ کو "آڈٹ آفت باونڈز" نہ کرتے بلکہ اسے اسلام آباد کا مرکز مان کر اس کے ارد گرد شہر پلان کرتے۔

عورت کا الگیہ

آج کل عدالت کا تذکرہ عام ہو رہا ہے۔ اخباروں میں، گفتگوؤں میں، جائزوں میں بحثوں میں، چائے غانوں میں، مسجدوں میں، ادبی مختلوں میں۔

جب سے اسلامائزیشن کی بات چلی ہے، عورت کا تذکرہ بھی چل نکلا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے اسلامائزیشن کے عس کا عورت سے خصوصی تعلق ہے۔

چند ایک دانشور چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ گپ شپ ہو رہی تھی۔ عورت کا ذکر چل نکلا۔ ایک نے کہا: عورت کی تمام توجہ بننے سنور نے پر مرکوز ہوتی ہے۔ دوسرا بولا: عورت بڑی بالتوں ہے۔ کتر کتر بالوں کے ڈھیر لگانے کی شوقتیں ہے۔ تیسرا نے کہا: عورت کی سوچ کبھی ذات سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ چھتا بولا: مرد کی ذمی اڑان میں عورت واحد رُکا دٹھے۔ وہ سب عورت کے عجیب گئے میں ہصرد ف تھے۔ پھر کسی تفصیل پر بحث پھر گئی۔

ان کے قریب ایک شخص پنچ پچاپ بیٹھا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ ایک دانشور نے اس شخص سے مخاطب ہو کر لوچا گیوں صاحب، اس مومنع پر آپ کی کیا رائے ہے؟“ وہ شخص بولا ”جناب، سبحان اللہ! کیا موضوع ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے آپ اس مومنع پر بات کر رہے ہیں۔ ذرا نہیں اکتائے۔“

شکر ہے عورت میں اس مومنع کی عظمت کا شعور پیدا نہیں ہوا، ورنہ ہم مردوں کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی۔

عورت کا میسے یہ ہے کہ وہ بات کی عیب جوئی پر توجہ دیتی ہے۔ یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی بات کس ذوق و شوق سے ہو رہی ہے۔

جب کڑی نگاہیں اس کا جائزہ لیتی ہیں کہ دوپتہ مرکا ہوا تو نہیں، جسم کے پیچ و خم اُبھرے ہوئے تو نہیں، بال جال بننے ہوئے تو نہیں۔ عورت نگاہوں کا کٹا اپن دیکھتی ہے یہ نہیں دیکھتی کہ نظریں جائزہ لے رہی ہیں۔ آخر جائزہ لینے کے لیے کوئی بہانہ تو ہونا ہی چاہیے۔ بہانے کا سہارا لیے بغیر بے باکا نہ جائزہ لینا — اُنہوں! مرد فطری طور پر ایسی جسارت سے محروم ہے۔

عورت نے ابھی تک یہ بھید نہیں پایا کہ ہم مردوں کی باتیں کرنے اور اس کا جائزہ لینے پر بھروسہ ہیں اور اس کے لیے بہانے ایجاد کرتے رہتے ہیں۔

پہلی غلطی تو اس طور نے کی۔ سوچے سمجھے بغیر اعلان کر دیا کہ انسان عقلی جیوان ہے۔ بے شک عقل کا آما جانا تھا لیکن عقل کا قیام نہیں۔ عقليہ بات سوچنے کی صلاحیت تو ہے لیکن کیا خراہش بھی ہے؟ کبھی کبھار مُخْد کا ذائقہ بدلتے کے لیے ہم عقل کو اپنا لیتے ہیں۔ دیسے بنیادی طور پر انسان عقلی نہیں، جذباتی جیوان ہے۔

اس طور کی اس بات نے بڑی غلط فسیاں پیدا کیں۔ کچھ بھل کر یہ زعم ہو گیا کہ وہ پہکا ہوا ہے۔ اس پر وہ مارے خوشی کے ڈال سے ٹوٹ کر یہ چھپے گر پڑا۔

దوسرا غلطی سائنس دالوں نے کی۔ انہوں نے بن سوچے سمجھے کہ دیا کہ مرد اور عورت ایک مخلوق ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ دونوں دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ دونوں کے ہاذوں ہیں ٹانگیں ہیں۔ دونوں کے شانوں پر سر رکھا ہو رہا ہے۔ اور سر پر مُخْد ہے، خدوخال ہیں۔ لہذا یقیناً وہ ایک سپیشی (۱۴۵۶۴) ہیں۔ سائنس دالوں سے یہ توقع نہ ہتی کہ وہ سلطی مشاہدے کے بل بستے پر نیصلدے دیں گے۔ انہوں نے اس حقیقت کو نہ جانا کہ اگرچہ دونوں الیوان باہر سے ایک جیسے ہیں لیکن اندر سے قطعی طور پر مختلف اور مختلف ہیں۔

سائنس دانوں کی اس خوش فہمی نے فرد اور عورت کے درمیان ایک دیوار گھٹا کر رکھی ہے، اس مفہوم سے کی بنا پر کہ دونوں ایک ہی مخلوق ہیں۔ مرد سمجھتا ہے کہ میں عورت کو سمجھتا ہوں۔ عورت سمجھتی ہے کہ میں مرد کو سمجھتی ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ زمرہ عورت کو سمجھتا ہے اور زمرہ عورت مرد کو سمجھتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش یا خواہش ہی نہیں ہے۔ کیسے ہو، جب بخوبی لیتیں ہو کہ ہم ایک ہی مخلوق ہیں؟ میری دلنشست میں عورت مرد کی نسبت برتر مخلوق ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان کی عظمت جذبے سے ہے اعلق کی بنا پر نہیں تو عورت لیتیں بھر مخلوق ہے۔

جذبے کی عظمت سے انکار کرنا ممکن نہیں، کیونکہ محبت، خودست، قربانی، میل ملáp، رشتے، یہ سب اوصاف جذبات پر استوار ہوتے ہیں۔ جذبات جوڑتے ہیں۔ عقل کا ٹھنڈا ہے۔ یہاں تک کہ ایمان بھی جذبے کے زور پر پیدا ہوتا ہے۔ عقل تو شکر ک دشمنات کو ہوا دیتی رہتی ہے۔

سب سے پہلی عقل کی بات یاد لیں۔ ابليس نے کی تھی۔ کہنے لگا: یا بادی تعالیٰ! میں اسے سجدہ کیسے کروں؟ میں برتر ہوں۔ یہ متنی سے بنائے اور میں آگ سے۔

اگرچہ مرد اور عورت دونوں میں جذبات موجود ہیں لیکن عورت کے جذبات نیادہ لطیف ہیں۔ ان میں قیام ہے بعصومیت ہے۔ روانی ہے۔

مثال کے طور پر مرد کے جذبات ہماروں نیم کی سرسرے مشابہت رکھتے ہیں۔ پرنس کو جتنی دیر دبائے رکھو گے، پرنس پیدا ہوتی رہے گی۔ چھوڑ دو گے تو ختم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس عورت کے جذبات کو تاروں والے ساز مثالاً سارنگی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ کسی تار کو چھپ دو تو اس کے ساتھ کے تار بھی لرزی میں آ جائیں گے۔ مضراب ہٹالینے کے بعد بھی سری گر سنجی رہیں گی۔ توجہات جاری رہیں گے۔

عورت کا جذبہ جسم کے بند بند میں رچا ہوتا ہے۔ اور اس رچاؤ میں ایک مٹھاں ہوتی ہے۔ ایک روانی۔ ایک لطافت۔

عورت میں سنسنیوں یا حساسیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر کارپوسور زیادہ حساس ہوتا ہے۔ لہذا وہ مرد کی نسبت زیادہ بیتی ہے۔ خوشی اور غمی دلوں کی قیمتیں اس پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ان کی قیمتیں سطحی اور دقتی اثاثات رکھتی ہیں، جیسے کسی تالاب میں ایک پتھر چینک دو تو نتیجہ جو لمبی پیدا ہوں گی اور عورت کے جذبات کی آئینہ دار ہوں گی۔ لہرا یوں سے اٹھیں گی اور سطح پر چاروں طرف پھیل جائیں گی۔

اسی حساسیت کی بنا پر عورت مرد کی نسبت زیادہ جعلی ہے۔ چونکہ زندگی میں دُکھ کا عصر زیادہ ہے اس لیے عورت کی زندگی میں دُکھ زیادہ ہوتا ہے۔ ہم مردوں کو دُکھ اور شکھ کے مفہوم سے اتنی گھری واقفیت نہیں رکھتے جتنا عورت رکھتی ہے۔

عورت کو فخرت کی سب سے بڑی دین ملتا ہے جو انسانی نسل کے تحفظ اور پرورش کا ذریعہ ہے۔ جو ایک ایسا دھارا ہے جس سے بہت سے مثبت جذبات پھوٹتے ہیں۔ دُلت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں نئی روشن کے تحت عورت نے لڑکی بن کر جینے کو اپنا لیا ہے۔ وہ عورت بن کر جینے سے امر جبک ہو گئی ہے۔ پرانے زمانے میں جن کامیاب صحت مند مکیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب پچکے ہوئے گالوں والی نزدِ کوئی انہیں لڑکی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عورت میں ملتا کا دھارا اسکو کھاتا جا رہا ہے۔

دہ پکوں کو اپنانے سے شرمنے لگی ہے۔

اسے اماں کھلانے سے چڑھ ہو گئی ہے۔ کہتی ہے : مجھے آپا کہ کہ بُلاڈ۔ باجی کھو۔ ماں نہ کھو۔

وہ پکوں کو دُددھ نہیں پلاٹی۔ اس سے فیکر خراب ہو جاتی ہے۔ پچکے کو دُددھ نہ

پلانے کی وجہ سے بچوں سے ماں کا رشتہ کمر دردہ جاتا ہے۔

ممتاز کے جذبے کا صرف بچوں سے ہی تعلق نہیں ہوتا، میاں سے بھی ہوتا ہے۔

چونکہ ظاہری چھوچھاں اور ٹینیں کے باوجود میاں درحقیقت ایک بچہ ہوتا ہے، اس لیے سہاگ اپنے قیام کے لیے بڑی حد تک ممتاز کا محتاج ہے۔ پنجابی میں مثل مشہور ہے کہ دو ہی بچی مان ہوندی اے۔ مطلب یہ کہ بیوی درپرداہ ماں ہوتی ہے۔

یہ لڑکی پن کا جزو کیسے پیدا ہوا؟ مجھے اس کا علم نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ہمارے ماں یہ جزو روز بردز شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

چند مشاہیر نقیبات کا مفروضہ ہے کہ چونکہ عورت کی سب سے بڑی خواہش توجہ طلبی اور جاہانگیر ہے، اس لیے اس کا روپ بہر و پ مرد کی خواہش کے تابع ہے۔ اگر مرد موٹی عورت کو پسند کرنے لگیں تو غریبی موٹی ہوتی جائیں گی۔ اگر مرد بھینگی کو رتوں کو پسند کریں تو عورتیں بھینگی ہو جائیں گی۔ اگر مرد ایمک عورتوں کو پسند کرنے لگیں تو عورت کا جسم خون بنانہ پسند کر دے گا۔ پرانے زمانے میں گلاب سے گالوں کو پسند کیا جاتا تھا۔ آجھکل بچکے ہوئے گالوں کو پسند کیا جاتا ہے۔

پتا نہیں یہ مفروضہ کس حد تک درست ہے۔ بہر صورت یہ امر مسلم ہے کہ آجھکل ہمارے ہاں عورت پر لڑکی بن کر جینے کا جائز طاری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فیض زیادہ دریں تک نہیں جل سکتا، کیونکہ یہ نظرت کے منافی ہے۔ اور فطرت کو بقاء نوی انسانی مقصد ہے۔ فطرت کا منشا ہے کہ عورت ماں بن کر جائے۔

عورت کی زندگی کا سب سے بڑا الیتی محبت سے متعلق ہے۔ مرد اور عورت کی محبتوں میں ایک بندیادی فرق ہے۔

مرد محبت کرنا چاہتا ہے۔ محبت کرنا اس کے بس میں ہے۔ جسے چاہے، جب چاہے، کرے۔ محبت کرنے کا طاپ یادِصال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس

عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ چاہی جائے۔ یہ فعل اس کے بس میں نہیں۔ اس کا انحصار دوسرے پر ہے۔ دوسرا چاہے، نہ چاہے۔

آج کل آنزادی کے دور میں یہ بات اور بھی یہ چیز ہو گئی ہے، کیونکہ عورت خالی چاہے جانے کی نیتی نہیں بلکہ اس بات کی خواہاں ہے کہ جو مرد اُسے پسند ہے وہ اُسے چاہے۔ پتا نہیں کیوں ہم مردوں نے یہ خوش فہمی پیدا کر رکھی ہے کہ عورت کی چاہے جانے کی خواہش جسم سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عورت سے جسمانی ملاپ کر لو تو وہ مغلن ہر جاتی ہے۔ یہ مفروضہ قطعی طور پر غلط ہے۔ عورت کو درحقیقت ایک محبت بھری گود پایہ نیے۔ محبت بھرما محل۔ محبت بھری دفا۔

بنیادی طور پر وہ جسمانی ملاپ اس لیے گوارا کر لیتی ہے تاکہ محبت بھری فضافتہ ہے۔ ٹوٹنے نہ پائے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایسی عورتیں بھی ہیں جن کا مقصد صرف جسمانی ملاپ ہے۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اتنی کم کہ آپ اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ صورت حال نارمل نہیں۔ آپ اسے بیماری سمجھ سکتے ہیں۔ ہومیوپتیکی میں ایسی ادویات موجود ہیں جو اس بیماری سے شفادار سکتی ہیں۔

المبة ایک بات اہم ہے۔ وہ یہ کہ ناگواری کی صورت میں بھی، جسمانی فرب کے دردان، ایک مقام ایسا آتا ہے جب عورت کا جسم جاگ اٹھتا ہے۔ ذہن مغلوب ہو جاتا ہے اور وہ بے لبس ہو کر وہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلی عورت میں فطرت نے ٹانک رکھی ہے۔

بھر طور ایک بات مسلکہ ہے کہ محبت کے جذبے کے تحت مرد میں جسم کی طرف رجمان عورت کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ شووانی عورتوں کے مقابلے میں ایسی عورتوں کی تعداد کمیں زیادہ ہے جنہیں جسمانی ملاپ سے قطعی رغبت نہیں۔ بلکہ جن کے لیے جسمانی ملاپ

تکلیف دہ ہے۔ اور وہ اس تکلیف کو صرف اس لیے برداشت کر لیتی ہیں کہ محبت کی
فضا سے محروم نہ رہ جائیں۔

اگر ایسی عورتوں کو ناعورت کہا جائے تو شوانی عورتوں کی نسبت ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔
زیادہ ہے۔ بلکہ نامندر دلوں کی نسبت بھی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔
عورت کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ وہ انہما محبت کر دیتی ہے، اور یوں دل سے
اُڑ جاتی ہے۔

دلیے ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ عورت میں جذب کر لینے یا سہ جانے کی طاقت
بہت زیادہ ہے۔ مرد میں کرتے کی طاقت زیادہ ہے۔ اسی جسمانی طاقت کے بیل بوتے پر
وہ لامگی بنا پھرتا ہے، اور بھیس پر مکومت کر رہا ہے۔

سر جانے یا جذب کر لینے کی طاقت افضل تر طاقت ہے۔ لیکن ہم نے کبھی اس
طاقت کی عملیت کو تسلیم نہیں کیا۔ انسان کو مذہب ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ لیکن آج
بھی لامگی کی طاقت کاراج ہے۔ اس کے باوجود جذب کرنے اور سہ جانے کی طاقت مذہب
کے، تندیب کے اور روحانی ارتقا کے لحاظ سے افضل صلاحیت ہے۔ عورت کی اس
خصوصیت کو متنظر رکھتے ہوئے چاہیے تو یہ کہ وہ محبت کو بھی جذب کرے، اس کا اظہار نہ
کرے اور مرد کے دل سے نہ اگزے، لیکن کہ مرد تو بے پروا، بے نیاز اور بے دفاع عورت سے
محبت کرتا ہے۔ یہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔ ہتھیار ڈال دینے والی یا خود کو حوالے
کر دینے والی عورت اس کے دل سے اُڑ جاتی ہے۔ مرد کو تو چیلخ چلایے۔

بے شک عورت محبت کو جذب کیے رکھتی ہے۔ لیکن اس کا کیا جائیے کہ محبت
عورت کے روپ میں روپیں میں بھی ہوتی ہے۔ امریں لے رہی ہوتی ہے۔ وہ مخفی سے محبت کا
اظہار نہ بھی کرے تو بھی اس کا انگ انج بوتا رہتا ہے۔ محبت کا انہما کرتا رہتا ہے۔ اُرتبی میں
چھوٹی سمجھائے دیوتا کے گرد بھرتا رہتا ہے۔ دیوتا کو بتائے بنا پتا پل جاتا ہے کہ بجاں تو مر من۔

پر دیگی کا یہ احساس مرد کے لیے ناقابل قبل ہے۔ لہذا پھر ان اس کے دل سے اُتر جاتی ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے گھرانے ایسے ہیں جہاں بیوی نے اپنی قدر و منزلت کھو دی ہے، صرف اس لیے کہ وہ میاں پر مرٹی۔

اپنی عظمت قائم رکھنے کے لیے عورت کے لیے سب سے بڑا حریم فاصلہ ہے۔

مغرب کی عورت نے جوشِ آزادی میں اس حربے کو ترک کر دیا ہے۔ خود کو عام کر دیا ہے۔ اور اپنی قدر و قیمت کھو دی ہے۔ اسی وجہ سے وہاں شادی کی تقدیس ختم ہو چکی ہے جبکہ لاب پ کی تقدیس ختم ہو چکی ہے۔ لہذا احتلاط گائے بھینسوں کے لاب پ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جبکہ جس ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مرد نامرد ہوتے جا رہے ہیں۔ لاب پ میں لذت کا عنصر ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام میں فاصلے کی تائید اسی لیے کی جاتی ہے کہ عورت اور جنس کی تقدیس قائم ہے۔

پاکستان

جس زمانے میں پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی، ان دنوں میرے دل میں پاکستان کے لیے کوئی جذبہ نہ تھا۔ نہ مثبت نہ منفی۔ میرے لیے پاکستان کا کوئی ظہوری ہی نہ تھا۔ سمجھیں نہ آتا تھا کہ مسلمان انگ ملک کیوں مانگ رہے ہیں۔ سمجھیں نہیں آتا تھا کہ مسلمانوں کے اس مطلبے پر ہندو کیوں چراغ پاہوتے ہیں۔ حصول پاکستان کی جدوجہد میرے لیے ایک ایسا ڈراما تھا جو سامنے گردود رہ بہت دُور کھیلا جا رہا تھا۔ اس ڈرامے کو میرے جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے ہی جیسے کسی چیز کو آپ دیکھتے ہیں، اس پر سوچتے ہیں، ذہنی طور پر اسے سمجھتے ہیں لیکن وہ آپ کی زندگی کا جزو نہیں نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسلامی جذبے سے قطعی طور پر کو رکھتا تھا۔

اُسی دور کی بات ہے، میرا ایک دوست تھا مجید ملک۔ تھا تو مغرب زدہ لیکن قیام پاکستان کی جدوجہد میں پیش پیش تھا۔ ایک روز میں نے ملک سے پُرچا "مجھی، سمجھیں نہیں آتا تھا قیام پاکستان کے لیے تم اتنے دُکھی کیوں ہو رہے ہو؟"

وہ ہنسا۔ بولا "ظاہر ہے۔"

میں نے کہا "ظاہر تو کچھ بھی نہیں۔"

بللا" مجھی، اس لیے کہ میں مسلمان ہوں ॥

اس پر میری انسنی نکل گئی۔ میں نے کہا "بھائی میرے، نہ تم غاز پڑھتے ہو، نہ روندہ رکھتے ہو، نہ تھارے رہن سمن میں اسلامی جملک ہے۔ پھر تم مسلمان کیسے ہوئے؟"

مجید ملک نے کہا "اس طرح کہ اگر میں گھر سے باہر نکلوں، دیکھوں کہ بازار میں ایک ہندو اور مسلمان اپنے میں لڑ رہے ہیں تو میں یہ لوچھوں گا کہ بات کیا ہے، یہ نہیں سوچوں گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا یا قصور کس کا ہے۔ پوچھے بغیر میں ہندو کو پہنچنا شروع کر دوں گا۔ مسلمان ہونے کی بھی ایک نشانی ہے۔ اور میں تو تجویز خالی مسلمان ہی نہیں پکا مسلمان ہوں، پکا۔"

"لیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

ایک ساعت کے لیے اس نے سوچا۔ پھر بولا "مثلاً اگر ابھی اس کمرے کی چھت پھٹ جائے اور اپر سے ایک تخت اُٹر آئے۔ تخت پر ایک فرشتہ بیٹھا ہو، فرشتہ مجھ سے کہ کر اللہ میاں نے مجھے تھارے پاس بھیجا ہے، فرمایا ہے کہ جاؤ مجید ملک پر اس حقیقت کا انکشاف کر دو کہ اسلام سچا نہ سب نہیں ہے، تو میں فرشتے کو جواب دوں گا کہ اللہ میاں سے میر اسلام کہنا اور عرض کرنا کہ حضور کا پیغام مل گیا۔ تسلکری۔ لیکن مجید مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔"

مجید کی اس بات نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ کئی روز میں گھری سوچ میں پڑا رہا۔ شاید بنیادی طور پر مذہب جذبے ہی کا نام ہے۔ اس کے باوجود میرے دل میں جذبہ پیدا نہ ہوا۔ نہ اسلام کے لیے نہ پاکستان کے لیے۔

پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے جب چھرا بازی کے واقعات عام ہو گئے تھے، میں بمبئی میں مقیم تھا۔ ان تشدید بھبھے و واقعات کو دیکھ کر مجھے ہندوؤں پر غصہ آنے لگا۔ آخر قیامِ پاکستان پر وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے تھے؟ کیوں تشدید پر تکے ہوئے تھے؟ سڑکوں پر اور گلیوں میں نہستے راہ گیوں کو خیزمارنے سے کیا پاکستان کے قیام کو روکا جا سکتا ہے؟ پاکستان میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

انی دنوں مبینی کی سیٹی پر پاکستان کے قیام کے خلاف کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ان کھیلوں کے رُوح رہاں پر تھوڑی تازج تھے۔ پر تھوڑی راج کو میں ایک عظیم فن کا رسم بھتتا ہوں۔ ان دنوں بھی میرے دل میں ان کے لیے بے پناہ عزت تھی۔ ایک روز میں کھیل دیکھنے لگا۔ پیش کش عالی تھی۔

اداکاری معدہ تھی۔ لیکن پاپینڈنڈہ بھونڈا تھا، کھیل ختم ہوا تو تھیٹر کے تمام دردازے بند کر دیے گئے۔ تماشا یوں کے باہر نکلنے کے لیے ایک خصوصی راستہ کھول لگا۔ یہ راستہ ایک تنگ اور گھومتی ہوئی گلی پر مشتمل تھا جس میں سے صرف ایک اُدمی گزر سکتا تھا۔ اس لیے تماشائی ایک دُسرے کے یہچے لمبی تطاریں آہستہ آہستہ میں رہے تھے۔ گلی کے لیکن فراخ گوشے میں پرتوی راج تھیٹر والی میک آپ میں کھڑا تھا۔ اس کا سر عجز و احترام سے بھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دامن کو جھوپی بنا کر تھام رکھا تھا۔ جھوپی نڈوں سے بھری ہوئی تھی جس میں چند ایک چیک بھی تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ قیامِ پاکستان کے خلاف پاپینڈنڈا کرنے کے لیے ”دان“ مانگ رہا تھا۔ پرتوی راج کو عجز کی تصور بنتے دیکھ کر میرے دل میں پیار کا ایک ریلا اٹھا، لیکن جھوپی دیکھ کر عفster آگیا۔ یہ شفعت کیا تو قہر رکھتا ہے مجھ سے؟ — جی چاہا کہ جیب سے لاطخ نکال کر پرتوی راج کو مٹکا دکھاؤں اور دانت ہیں کر کہوں ”اتنی جسارت!“ لیکن طبعاً میں ایک گمزور آدمی ہوں اور مغل کے زنج سے ہست کر بات کرنے سے ہچکپا تا ہوں۔ میرا ہاتھ مُکاذب بن سکا۔ اُٹا اس نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر پرتوی راج کی جھوپی ڈال دیا۔

اس رات عفتتے کی دببر سے مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے اپنے آپ پر عفتر آرہا تھا۔ میں نے پاکستان کے خلاف چندہ کیوں دیا؟ کیوں؟ میں نے پرتوی راج کو مٹکا کیوں نہ دکھایا؟ اس کے بعد جب بھی خبر آئی کہ کسی غنڈے نے راہ گیر مسلمان کے پیٹ میں چھرا جھونک دیا ہے تو میں محسوس کرتا کہ وہ غنڈا میرے ان پانچ روپے کے عوض کرتے پریا گیا تھا۔ میرے اس پانچ روپے کے نزٹ کی دببر سے ایک مسلمان کا پیٹ چاک ہو گیا تھا۔ غنڈے کے چھرے کے دستے پر میرزا نام کندہ تھا۔

چھرا چلانے کی دار داتیں بڑا ہی گئیں۔ نفرت کے جذبات کی دببر سے میں غنڈوں کی طرف سے یہچے ہستا گیا۔ پاکستان کے قریب، اور قریب اور قریب۔ بجائت سے میری یہ پسپائی نفرت اور ڈر کی دببر سے تھی جس میں نفرت کا عنصر ڈر پر غالب تھا اور یہ نفرت کبھی کبھاں

اتی شدت اختیار کر لیتی کہ میرا بھی چاہتا، بھر سے بازار میں نعرہ لگاؤ۔ "اللہ اکبر؛ پاکستان
ذندہ باد!"

اُس روز احمد بیشیر اور میں بھائی کے ایک ہندو علاقے سے گزر رہے تھے۔ ذاتی طور پر
میں کبھی اس علاقے سے گزرنے کی جسارت نہ کرتا۔ مگر میرا ساتھی احمد بیشیر طبعاً خطرے سے دوچار
ہونے کا دلدادہ ہے۔ وہ پیدائشی پاکستانی ہے۔ ڈر اور خوف سے بے پروا۔ خطرے کا پروا۔
دھ مجھے زبردستی ایسے مقامات پرے جاتا تھا۔ دفعہ ٹرینک گرگ گئی۔ چوک میں ہندوؤں کا
ایک جو جم کھڑا تھا۔ سب پیل چلنے والے بائیں بڑھ کی پڑھی پر آ جاتیں۔ کسی نے لاڈ پسیکر پر
اعلان کیا۔ تمام لوگ پڑھی پر اکٹھے ہو گئے، اور باری باری کیوں میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے
گھبرا کر احمد بیشیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں صلیب ہیں چھوٹ رہی تھیں۔ ہنوتیں پر تسلیم تھیں۔
پڑھی پر ایک میز رکھا تھا۔ ایک آدمی جسٹر سامنے رکھے گئی پر بیٹھا ہوا تھا۔ راہ گیر جسٹر پر
اپنا نام اور ولادیت لکھوارہ تھا۔ میں نے سوچا کہ نام لکھنے کا مقصد مسلمانوں کو چھانٹتا ہے۔
"اکھر" میں نے با آدا بلند احمد بیشیر سے کہا۔ پسلے تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر
سمجھ گیا۔ "اکھر، یہ سب کیا ہے؟" میں نے دُہرایا۔ "کچھ بھی نہیں، مائیکل"۔ اس نے با آدا بلند کما
اور ہنسنے لگا۔ گورنمنٹ کے نام کوئی عرض داشت نہیں جائز ہی ہے، جس پر دستخط کرا رہے ہیں۔
کیوں نہ تھا؟ اس نے ساتھ کھڑے لالہ بھی سے پوچھا "اوکے؟"

جب میں جسٹر پر دستخط کرنے لگا تو بھی پر ایک درخت سی سورا ہو گئی۔ جی چاہا کہ
یقین یعنی کہ کوئی میں محمد ممتاز ہوں، محمد ممتاز۔ میں مسلمان ہوں۔ میرے پیٹ میں پھرا ہوئے
دد۔ دہی پھرا جسے ان پانچ روپوں سے خریدا گیا ہے جو میں نے چند سے کے طور پر دیے تھے۔
میں نے پاکستان کے خلاف جرم کیا ہے۔ یہی میری سزا ہے۔ لیکن میرے ہل میں آواز بھی کسی
نے میرا اعلان نہ سُنا اور میں نے چپکے سے مائیکل مونٹی ولد جان مونٹی بقلم خود جسٹر میں لکھ دیا
اور آگے چل پڑا۔

یہ سچ ہے کہ مجھ میں جرأت نہ تھی۔ لیکن پاکستان اور میرے درمیان اب قطعی طور پر کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ پاکستان میرے جذبات میں داخل ہو چکا تھا۔ بظاہر ایک دیوار حائل تھی۔ جرأت کی دلیوار۔

پھر جو میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا تو کسی میں بھی جرأت نہ تھی۔ کانگریس مسلمانوں اور صنیا کو دھوکا دے رہی تھی۔ پر تھوڑی راجح اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ سب بھروسے تھے۔ صرف دو افراد سچتے تھے۔ صرف دو۔ ان میں خلوص تھا۔ وہ پاکستانی جو اللہ اکبر کے نفرے لگاتا تھا اور وہ غنڈا جو مسلمان را ہاگیر کے پیٹ میں پھرا بھونکتا تھا۔ اور میں۔ بے شک میں بزرد تھا۔ میرا حل جذبے سے خالی تھا۔ لیکن میں بھوٹانہ تھا۔ نہ دوسروں کو فریب دیتا تھا، نہ اپنے آپ کو۔

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کا دن آگیا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کے لیے مشہبت جذبہ محسوس کیا۔ رات کے باہر بجئے والے تھے۔ ہم ریڈیو سیٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ ریڈیو پیکنگ ٹیوں نے بھی اسی تھی۔ دن کی گلگت عجیب سالاریاں پیدا کر رہی تھیں، جیسے طبل جنگ نج رہا ہو۔ اور پچھے سروں میں طوطی للاکار رہی تھی۔ لیکن میرے لیے اس سینکپنگ ٹیوں کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ میں کسی کتاب کے مطالعے میں جو تھا۔ دفترہ اعلان ہوا: ریڈیو پاکستان۔ میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔ سارے بدن پر بھونٹنے رہ یگئے لگے۔ دل میں ایک ہوا اسی چھوٹی۔ سارے وجود میں رنگین ستارے ناچنے لگے۔ پاکستان کے لیے یہ پہلا مشہبت جذبہ تھا، جس نے ان جانے میں میرے بند بند کو جھبجوڑ دیا۔ جیسے چودھویر کا چاند سورے ہرئے سمندر کو چاپک مار کر جگا دیتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد بھی میں شہرت اور امدادت کے واضح امکانات حمل دکھائی دینے لگے۔ ساز و سامان، جس کے حصول کے لیے ہم بھی گئے تھے، اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ لہذا احمد بیشرا درمیں جوں توں پاکستان آپنے۔ یہاں آپنے کو صرف ایک نکردامنیگر تھا کہ اپنے عزیز و اترما

کو منع گرد اپنے سر سے نکال کر پاکستان لے آئیں۔ پاکستان ہمارے لیے دارالسلام بن گیا تھا۔ پاکستان میں ہمارے لیے ہم اپنے اسلامیوں کے لیے سلامتی تھی۔ اب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہوں۔ چاہے میرے دل میں ایمان کی روشنی تھی یا نہیں تھی۔ چاہے یہ زندگی اسلام کے رنگ میں رنگی تھی یا نہیں۔ چاہے میرے قلب میں اسلامی جذبہ تھا یا نہیں۔ بہر حال میں مسلمان تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ما جرین کے کپوؤں میں مسلمانوں کی حالتِ زارِ دیکھ دیکھ کر مشرقی پنجاب میں کشتِ دخون کے دائمات کے باسے میں شن من کر، بھارت کے روئیے کو دیکھ دیکھ کر زیرِ خیال مستحکم ہوتا گیا کہ پاکستان سے ہماری زندگی اور سلامتی واپسیتے۔ لیکن ابھی تک یہ جذبہ خام تھا۔ جذبہ خفظِ المقدّم کے لیے تھا۔ اپنی ذات کے لیے محدود تھا۔ ضرورتِ حق کی پیداوار تھا۔ بھارت کے طرزِ عمل کا ردِ عمل تھا۔ یہ جذبہ اسلام کی عظمت کا حال نہ تھا۔ اسکے سال گزر گئے۔

اس عرصے میں ایک ایسے ادیب سے یہ میری راہ و رسم ہو گئی جو اسلامی جذبے سے مرشار تھے اور جن کی زندگی میں عملی طور پر اسلامی رنگ بنایا تھا۔ ایک روز میں ان کے ہاں گیا تو درباں ایک معمتر اکدمی خواجہ صاحب بیٹھتے تھے۔ ہمارا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کئی بار خواجہ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب کم گوختے۔ اپنی بات کھنکے بجا سے دوسرے کی بات سننے کے عادی تھے۔ ذہین اور باریک بین تھے۔ درسوں کی مدد کرنے کے دلدادہ تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راست گو تھے۔ ایک روز میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ خواجہ صاحب اچھے بزرگ ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب میں بُزرگ کی خصوصیت دھکائی نہ دیتی تھی۔ میرے نزدیک بزرگ وہ ہوتے ہیں جو جنادھاری ہوں۔ جن کی ہر بات سے ذاتی اہمیت مترسخ ہوتی ہو۔ جو دل اش بناؤ کر سیکھنے کے عادی ہوں اور پنڈوں نصیحت سے شفعت رکھتے ہوں۔ خواجہ صاحب میں ایسی کوئی بات بھی تورہ تھی۔ ان کی گفتگو میں روحاںیت کی طرف کوئی اشارہ نہ ہوتا تھا۔ بلکہ عام دُنیا دی مسائل پر وہ بڑے ذریک انداز میں دُنیا دی نقطہ نظر سے بات کرنے کے عادی تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے خواجہ صاحب سے ملنا جناب جاری رکھا ورنہ اگر مجھے ذرا بھی شبہ

پڑھاتا کہ وہ بزرگ ہیں اور دوستی سے تعلق رکھتے ہیں تو میں یقیناً ان سے مجھے بڑھ جاؤ،
کیونکہ مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہ ہتی۔

ایک روز میں قبرستان کی طرف جانکلا۔ دیکھا کہ ایک مسحولی سی چار دیواری کے اندر خواجہ
صاحب ایک مرد اپنے فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ میں رُک گیا۔ فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب
حسبِ دستور برڑے تپاک سے ملنے۔ کھینچ لگے "کیہے، کیا حال چال ہے؟" میں نے کہا "جی، کوئی خاص
اچھا نہیں۔ میں غم کھا رہے ہیں۔" بولے "کیوں؟ غم کس بات کا؟" میں نے کہا "خواجہ صاحب،
پاکستان کا کیا بننے گا؟ یہ کشی تو دُول رہی ہے۔" میں نے یہ بات تفسیر ہاگر کوئی نہ ہتی۔ یہ درست ہے
کہ مجھے پاکستان کے ڈولنے کا احساس تھا ایکن پاکستان کے لیے کوئی خاص لگن میں نے کبھی عجous
نہ کی تھی۔

خواجہ صاحب میری بات سن کر دنعتاً سنبھال ہو گئے "مفتی صاحب" وہ بولے "پاکستان کا
غم آپ کیوں کھاتے ہیں، جب کہ پاکستان کا غم کھانے کے لیے بڑی بڑی ہستیاں موجود ہیں؟
آپ کوادر مجھے غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟" ایک ساعت کے لیے وہ رُک گئے۔ پھر بولے
"اس بُڑھے کو دیکھتے ہیں آپ؟" میں نے اُس جانب دیکھا جاہر خواجہ صاحب اشارہ کر رہے
تھے۔ وہاں کوئی بُڑھا نہ تھا۔ کیا وہ اس قبر کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس پر وہ ابھی فاتحہ
پڑھ کر آئے تھے۔ خواجہ صاحب بولے "اس بُڑھے نے اپنی تمام زندگی قیام پاکستان کے لیے وقف
کر دی تھی۔ یہ بُڑھا اسی بُڑھے کا لگایا ہوا ہے۔"

"مفتی صاحب" وہ مسکرا کر کھینچ لگے "پاکستان کے لیے بہت عظیم ہستیاں کام کر رہی ہیں۔ آپ
کیوں غم کھاتے ہیں؟"

"تو ہر میں کیا کروں؟" میں نے از راہ مذاق کہا۔

"آپ صرف اتنا کریں کہ ہر کام سے پہلے سوچیں کیا آپ پاکستان کے مفاد کے مطابق
کام کر رہے ہیں۔ آپ کا قدم پاکستان کے مفاد کے خلاف تو نہیں۔ اس میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔"

پاکستان تو بہر صورت پھلے چھوٹے گا۔ اس کی بہار دیکھ کر لوگ عش عش کریں گے۔ انشاء اللہ!

خواجہ صاحب کی بات سن کر مجھے بے حد حیرت ہوتی۔ خواجہ صاحب نے تو کبھی اسی بات نہ کی تھی۔ انھوں نے تو کبھی بڑا لامکی تھی۔ ان کی بات بڑی زیر کہوتی جو عمل دنیا سے متصل ہوتی تھی۔ وہ پر پرسق کے حق میں نہ تھے۔ چھروہ بڑھا کون تھا جس نے پاکستان کا بڑا الگایا تھا؟ دہ بڑی استیاں کوں تھیں جو پاکستان کا غم کھانے پر مامور تھیں؟ پاکستان میں کیا خصوصیت ہے کہ بڑی ہستیاں اس پر مامور ہوں؟ پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس میں ابھی تک کوئی اسلامی خصوصیت پیدا نہیں ہوتی۔ اور اسلامی ملک تعداد میں بیسیوں ہیں۔ سب کی حالت ناگفۃ ہے۔ خواجہ صاحب کی بات تمہل نظر آتی تھی۔ ان کی بات کی طرف توجہ کرتا تو وہ بے معنی معلوم ہوتی۔ ان کے کدار کی طرف نظر جاتی تو از سر نوشش و پنج میں پڑھتا۔ خواجہ صاحب کی زیر کی۔ ان کی راست گوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

خواجہ صاحب میں ایک بعیب خصوصیت تھی۔ جب بھی دہ اللہ کا نام لیتے تو کچھ ایسے انداز میں بات کرتے جیسے اللہ ان کے پاس بیٹھا ہو، اور اللہ کا ایک خصوصی پر وکرام ہو، اور وہ کُن ک کر تخلین کرنے والا اللہ نہ ہو بلکہ ہر لمحے محنت مشقت اور مزدوری کرنے والا ہو، جس کے باہم محنت کرتے کرتے بھروسے ہو چکے ہوں اور جو ہر بات میں دوسروں کا باہر ہی نہ کا دلدار ہو۔ ان کی یہ بات مجھے کھلی تھی۔ خواجہ صاحب نے اللہ کو مردود بنانا رکھا تھا۔

اللہ کا میں بڑا قابل تھا میرے ذہن میں اللہ کی دو خصوصیات نمایاں تھیں؛ اس کی عظمت اور بے نیازی۔ اللہ کی عظمت کا احساس فکریات اور جمادات کے مطابع سے پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی بے نیازی میرا اپنا تاثر تھا۔ میں اسے رب العالمین سمجھتا تھا، رب المسلمين نہیں۔ میرے نزدیک اللہ ایک غلطیم شہنشاہ تھا جس کی ریاست سیکھ تھی۔ اسلام میرے نزدیک ایک ضابط عمل تھا جو صرف بنی نور انسان کے لیے باعث فلاح تھا جس کے لیے اللہ کو اپنے طرز عمل میں رد و بدل گوارا نہ تھا۔ میرے اللہ کو افراد سے دلچسپی نہ تھی۔ مذہب کے

نقطہ نظر سے رعایت کا سوال ہی پسیلانہ ہوتا تھا۔ پھر پاکستان کی امتیازی حیثیت کے کیا ہے؟ ساری بات ہی بے ہنگم ہتی ۔۔۔ اس کے باوجود چونکہ وہ بات خواجہ صاحب نے کی ہی، میرے دل میں گو گو کا عالم پیدا ہو گیا۔ دل میں اک چھانسی لگا گئی۔ پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یہ پہلا ذکرہ تھا۔

چار سال بیت گئے۔

مرا تباہ لہ ہو گیا اور مجھے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میرے نئے افسر میں چند ایک خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا۔ کم گو تھا۔ اس میں برداشت کا غفران قدر نیادہ تھا کہ دیکھنے والے کو خستہ آ جاتا۔ اور اس میں ذات کا خیال قلمی طور پر غفوقد تھا۔ صاحب نے مجھے بُلایا۔ بولے "آپ کام شروع کر دیں۔" میں نے کہا "میں سر۔" بولے "اس صندوقی میں تھیلے ہفتے کے خطوط ہیں۔ ان سب خطوط کو غور سے پڑھیں۔ میوھر و کے لحاظ سے اھلی ترتیب دیں اور سمری بنادیں۔ جو خط خصوصی توجہ کے قابل ہوا سے الگ کر دیں۔" میں سر میں نے کہا۔ "پچھڑا سی صندوقی سے آئے گا" وہ بولے۔ "آل رائٹ سر۔" میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے پہلا خط کھولا۔ لکھا تھا: اے شاہ تو لکنا غرش نصیب ہے کہ مجھے پاکستان کی بادشاہی کی عزت ملی۔

خط پڑھ کر میں سوچنے لگا: عجیب خط ہے۔ دوسرا خط کھولا تو اور بھی ہیران ہوا۔ لکھا تھا: خبردار! مجھے پاکستان میں آٹا ہنگناز ہونے دیکھو۔ تیسرا خط میں لکھا تھا: وہ وقت دور نہیں جب پاکستان میں ایسا عالم ہو گا کہ مدینے کے رہنے والے دیکھ کر کہیں گے، سبحان اللہ!

ان خطوط کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے یہ خط کیوں لکھے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا۔ بہر طور ایک بات واضح تھی کہ تو بہر حاصل کرنا مقصود نہ تھا۔ کیونکہ زیادہ تر خطوط میں لکھنے والوں کے نام بھی مرقوم نہ تھے۔ یہ خط دھاگو خادم یا عاجز پر ختم ہوتے تھے۔ بیشتر خطوط کا فذ کے پُرزوں پر لکھے ہوئے تھے۔ تحریر اور اندازہ بیان درنوں ہی خام تھے۔ اثرِ اتنے کاغذ غفوقد

تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے پسیے کیوں خرچ کیے تھے۔ وقت کیوں صرف کیا تھا۔ پھر میں نے ایک طویل خط لکھا۔ یہ خط جزوی ہند کے کمی شہر مامٹ سے موصول ہوا تھا۔ لکھنے والا سب زحیج تھا جو ۲۰ سال پیشتر ایک عادتی کی وجہ سے اپاچ ہو چکا تھا اور گزشتہ میں بس سے صاحبِ فراموش تھا۔ ان ۲۰ برس میں اس کا داد دکام عبادت تھا۔ خط میں تحریر تھا کہ میں یہ خط تمہارے لیے نہیں لکھ رہا بلکہ پاکستان کے لیے لکھ رہا ہوں۔ جلد ہی پاکستان ایک عظیم مملکت بن جائے گا۔ ایک عظیم نعم حاصل ہو گی اور پھر پاکستان دُنیا سے اسلام کا ایک مرکز بن جائے گا۔ ان خطوط نے مجھے پاگل کر دیا۔ یہ کوئی دُنیا تھی؟ یہ کس قسم کے لوگ تھے؟ خط لکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ سب مذہبی ہستی پر کے مریض تھے؟ جنونی تھے؟ مجازوب تھے یا جانگتے میں خواب دیکھنے کے عادی تھے؟ لیکن ان میں کتنی ایک خطوط پڑھے لکھے لوگوں کے بھی تھے۔ ہیرت کی بات تھی کہ ان خطوط میں کسی فرد کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ کسی فرد کی توفیر و تفعیلیم نہ ملی تھی۔ یہ خط قصیدہ گوئی سے خالی تھے۔ ان خطوط میں کسی مطلیٰ اعلیٰ کو خطاب نہ کیا گیا تھا۔ ان کا موڑ پاکستان تھا۔ پاکستان کی خصوصی عظمت۔ پاکستان سے رسول اللہ کا التفات۔ پاکستان پر اللہ کی برکت درحمت۔ ان خطوط کو پڑھ کر میں پاگل ہو گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی درحشت سوار ہو گئی۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ لوگ کون لوگ ہیں؟ یہ دُنیا کون سی دُنیا ہے؟ پاکستان کیا ہے؟ اسے کیا امتیاز حاصل ہے؟ کیمبل حاصل ہے؟

بلیعت کے لمحاظ سے میں ایک مجازوب واقع ہواں۔ عام حالات میں مجھ پر کسی داتھے کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن جب اثر ہو جائے تو میں شل ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے اندر لا ادا کھولنے لگتا ہے اور پھر گویا آتشِ مشاں جاگ اٹھاتا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر سپلے تو میں سوچا رہا، پھر ز جانے کیا ہوا کہ عقل و خرد کے دونوں کنارے ٹوٹ گئے، جذبے کا دھارا بہر نکلا اور ہیری میں دُلگھانے لگی۔ دو روز میں دیوالوں کی طرح اپنے گھر میں صحراء ندی کرتا رہا۔ پھر طوفان تھا تو میں سچھنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صاحب سے مل کر کہوں کہ جانبِ عالیٰ یہ خط میرے لیس کاروگ نہیں

ہیں۔ مجھے کوئی سینیدہ کام دیجئے جسے عقل سے تعلق ہو۔

تیسرے روز میں تیار بیٹھا تھا کہ جب بھی صاحب اکیلے ہوں تو میں جا کر ان سے بات کروں۔ عین اس وقت صاحب کا چپڑا اسی آگیا۔ میں نے سوچا، چلا چتا ہجوا۔ اس سے کہ دیتا ہوں کہ صاحب اکیلے ہوں تو مجھے اطلاع کر دے۔ چپڑا سی نے اُک کر کما جی، صاحب بلاتے ہیں۔ "صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے سوچا کہ صاحب اپنی بات کر لیں تو مجھر میں اپنی درخواست پیش کر دوں گا۔

اس وقت صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر کہ کما "آپ گیٹ پر سیکورٹی کے کمرے میں بچلے جائیں۔ وہاں ایک شخص مجھ سے ملنے کے لیے مصروف ہے۔ آپ اس سے بات کریں۔ کہیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ اگر وہ آپ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس سے بات پوچھ لیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر وہ مجھ سے ملنے پر مصروف ہے تو اسے جانے نہیں بلکہ مجھے اطلاع دیں۔ میں اس سے ملوں گا۔"

"یہ سر" — صاحب کی بات سن کر میں دروازے کی طرف مڑا۔ "اور دیکھیے" صاحب بولے۔ سیکورٹی کے کمرے میں بات نہ کریں۔ اسے باہر لے جائیں۔ علیحدگی میں سمجھے؟"
"یہ سر" — اس وقت صاحب سے اپنی بات کرنے کا موقع نہ تھا۔ میں نے سوچا، واپس پر بات کر دوں گا۔

سیکورٹی کے کمرے میں ایک دھقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اسے باہر باٹھچے میں لے گیا۔ "صاحب کام میں مصروف ہیں۔ میں نے کہا" انھوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر آپ یہ بتا دیں کہ آپ انھیں کس سلسلے میں ملا چلہتے ہیں تو۔"

میں ابھی چھڈنے کے بارے پایا تھا کہ وہ بولا "بابو جی، میں نے صاحب سے مل کر کیا لیتا ہے۔" مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں۔ میں اپنے گاؤں سے آرہا تھا۔ اس سڑک کے پاس مجھے ایک ساندھی نی سوار ملا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں پاس گیا تو وہ کہنے لگا : میاں اس مکان کے اندر جاؤ۔

صاحب سے مل اور ہمارا ایک پیغام اسے دے دو۔ سانڈنی سوار بزرگ آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ارادہ ہرگز گیا۔ لیکن پولیس والے دوسرے کی بات ہی نہیں سنتے۔ انہی کے جاتے ہیں۔“

میں نے کہا ”آپ پیغام مجھے دے دیں۔ میں صاحب تک پہنچا دوں گا۔“ ”سانڈنی سوار نے مجھ سے کہا تھا“ دہ بولا کجا کہ اس سے کہ دو کہ جو کاغذ درہ لکھ رہا ہے، دہ غلط ہے، اور جو وہ لکھ کو چھڑا چکا ہے کوہ صحیح ہے؟“

”عجیب تمہل سا پیغام ہے!“ میں نے سوچا ”ذمہ دار پاؤں۔ سانڈنی سوار کو صاحب کے نوٹ سے کیا واسطہ! اور پھر سانڈنی سوار بیان کہاں! میں نے تو یہی اس علاقے میں کوئی سانڈنی سوار نہیں دیکھا۔ یقیناً یہ دہ قان پا گل ہے۔“

مجھے یقین تھا کہ صاحب بات سن کر مسکرا دیں گے اور پھر کام میں مصروف ہو جائیں گے۔ لیکن ایک ساعت کے لیے دہ سوچ میں پڑا گئے۔ پھر نہایت سنجیدگی سے بولے ذرا یہ دلیست پیپر باسکٹ تو اٹھا یہی: ”میں نے ٹوکری اٹھا کر میز پر رکھ دی۔ دہ بڑی توجہ اور احتیاط سے کاغذ کے ٹکڑے سے ٹوکری میں سے چلنے لگے۔ یہ دیکھو کہ مجھے حیرت ہوئی۔ کیا صاحب سانڈنی سوار کی بات سچ مان لیتے ہیں؟“

صاحب نے دہ پُرڈے ببری جا نب بڑھا دیے۔ بولے ”اگر آپ کو فرصت ہو تو اخیں جوڑ دیجیے: ”یہ سر“ میں نے کہا۔ صاحب نے وہ نوٹ اٹھایا جو وہ لکھ رہے تھے اور اسے پھاٹکر ٹوکری میں ڈال دیا۔ حیرت سے میرا مختکھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ شخص جو اس قدر ذہین اور ذریک ہے کہ تم ابھی بات کرنے کے لیے مخفظ کھولتے ہیں تو ہمارا عندریہ بھاپ لیتا ہے، یہ شخص جو ہر ایک کی بات سننے کے باوجود اپنی رکھتا ہے، جن کے خیالات میں انفرادیت اور ندرت ہے، جو پہلے ہوئے رسمی خیالات سے دُور رہتا ہے، جسے تمہات سے دُور کا واسطہ بھی نہیں، یہ شخص ایک مہم سانڈنی سوار کی بات کو یوں اپنارہا ہے جیسے ہمیشہ سے اسے ایسے سانڈنی سوار دی

سے داسطہ رہا ہو۔ جیسے اس قسم کے پیغامات سے مانوس ہو۔ یہ کیا بھی ہے! میں نے کاغذ کے پرنسے جوڑے۔ وہ نوٹ پاکستان کے محوزہ آئین کی ایک اہم شق تھی، جسے اسلام سے تعلق تھا۔

اس کے بعد صاحب سے خطوں کی بات کرنا بے معنی نظر آنے لگا اور میں ان خطاں کی افت یاری میں کھو گیا۔ وہ خطر روز موصول ہوتے تھے۔ جیگہ جگہ سے موصول ہوتے تھے۔ لیکن عام طور سے ان کا موضوع ایک ہی ہوتا: پاکستان، پاکستان کا امتیاز، پاکستان کی آنے والی عظمت، خوشیدہ مستقبل۔ آہستہ آہستہ میں اس طوفان میں بہرہ گیا۔ میرے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ شاید یہ چوخی سمت بھی حقیقت ہو۔ شاید اللہ میاں کسی ملک یا فرد میں شخصی دلچسپی لینے سے گریز نہ کرتے ہوں۔ آخر دہ مالک اپنی دسمائیں۔ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہیں تو انھیں کون روک سکتا ہے۔ ایک روز صاحب نے مجھے بلا یا اور ایک کام دے کر اپنے ہی کمرے میں بھاگایا تاکہ دہیں بیٹھ کر ختم کر دو۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا کہ چپڑا سی آیا۔ صاحب سے کہنے لگا "سر میرا ایک چھاپ کی بارج کرنے گیا تھا۔ وہ مدینہ شریف سے آپ کے لیے ایک پیغام لایا ہے۔ حکم ہو تو اسے بلا گول!"

صاحب نے بڑی سمجھی گئی سے چپڑا سی کی بات سنی۔ بولے "بلاؤ۔ انھوں نے اپنا کام ایک طرف رکھ دیا۔ انھوں کو بدھ سے مصافحہ کیا اور بڑے غور اور احترام سے اس کی بات مُنتہی لگے۔

تمسید کے بعد بدھ نے کہا "جناب، وہ جملہ کے رہنے والے ہیں۔ فوج میں سپاہی تھے۔ بڑی جنگ میں لام پر گئے تھے۔ دہاں سے مدینہ شریف میں سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ بس دہاں بیٹھ گئے۔ آج تک دہیں بیٹھے ہیں۔ اب وہ روضہ مبارک کے چابی برداریں۔ یہ بہت بڑا عمدہ ہے، جناب۔ انھوں نے آپ کو پیغام بھیجا ہے۔"

صاحب نے سراشبات میں ہلا دیا۔

بڑھنے بات شروع کی۔ انہوں نے فرمایا کہ سن ۳۶ء میں ہم نے خواب دیکھا۔ دیکھا کہ مسجدِ نبوی سے ایک بیل بھولی اور بڑھتے بڑھتے دُور نکل گئی، اور اس کے پرے ہے پر سبز پیاس نکل آئیں۔

صاحب نے اشبات میں سر بلادیا۔

چار ایک سال کے بعد خواب میں بھرا سی بیل کو دیکھا۔ شاخ جوں کی توں قائم تھی لیکن پتیاں مُر رہا گئی تھیں۔ اب بھر خواب میں ہم نے وہی بیل دیکھی ہے۔ وہ بھر سے سر سبز ہو رہی ہے بھر سے کونپیں نکل رہی ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ہماری طرف سے جا کر مبارک باد دینا، اور ہمارا پیغام دینا۔ کہنا، مجھیڑوں کے رکھوا لے خود سائے میں نہیں بلیختے۔

جب تک وہ بڑھا بات کرتا رہا، کوشش کے باوجود میں اپنے کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ جب اس نے کہا کہ ہماری طرف سے مبارک باد دینا تو میں نے محسوس کیا جیسے مجھے مبارک باد دی جا رہی ہو۔ اس روز مجھے پاکستان کا ہر بولٹا مزید ہر رجھ انظر آئنے لگا اور ہر سوکھی شاخ سے نئی کونپیں چھوٹی نظر آنے لگیں۔ لاکھ لاکھ حول پڑھتا۔ اپنے آپ کو قائم کرنے کی کوشش کرتا لیکن بے سود۔ البتہ لیکہ کی اس دنیا میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ عجیب نہ تھا۔ میری عقل مجھے ملامت کرتی، لیکن مجھے اس نئے کی لوت پڑ رہی تھی۔ — بھر اللہ میاں میرے رو برو ایک سٹول پر آیا۔ میٹھے ان کے لاٹھوں میں اوزار بخنے۔ وہ کام میں منہک تھے۔ محنت کے پسینے سے شرلوک ہوتے۔ وہ تیزی میں منہک تھے۔ پاکستان کی تیزی۔ یہ میرے اللہ میاں تو نہ تھے۔ یہ تو خواجہ صاحب کے اللہ میاں تھے۔ میرے اللہ میاں جو دُور بہت دُور، اُو پر بہت اُو پر تھکت پر بیٹھ کر کُن کہا کرتے تھے۔ جو غمیم تھے وہ نیاز تھے۔ دُور تھے، اُو پچھے تھے وہ اللہ میاں پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جسے دیکھ کر میرا بند بند رہ زگیا۔ خوف سے میری گھٹتی بند رہ گئی۔ صاحب کے ایک درست نے فون کر کے انھیں بلایا۔ کہنے لگے کہ ہمارے ہاں ایک دریش آئے ہوئے ہیں۔ پہلے یہ حیدر آباد میں آئی جی پولس تھے، بھر بلا دا آگیا۔ سب کچھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ سے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

صاحب درویش سے ملنے جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اس درویش کی شکل بڑی
ڈرائی ہتھی۔ سیاہ رنگ، قلیوں کا ڈھانچا، خوفناک ایکھیں، کرخت آزاد۔ صاحب کا تعارف
کرنے کے بعد صاحب خانہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور صاحب اور وہ درویش جو مجھے سرہدی ہوئی
مرچ دکھانی دے رہا تھا اکیلے رہ گئے۔ میں بھتھ کمرے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔

دفعتہ اخبار میرے ہاتھ سے چھوڑ کر گزرا۔ بھتھ کمرے میں مرچ انگریزی بول رہا تھا۔ کوئہ رہا
تھا "فلے یُہ الاشیو۔ پیٹ بربن آن یُہ اینڈ پلیس یُہ ان دی سن" ارسے! یہ کیا صاحب سے کہ رہا
ہے؟ یہ درویش سے یا قصانی؟ -

"میں یہاں صرف اس مقصد کے لیے آیا ہوں" اس کی کرخت آزاد پھر گوئی "کہ تمہیں دارنگ
دول۔ تمہیں پتا ہے کہ اس سلسلے میں دارنگ نہیں دی جاتی۔ جو کوتاہی کرے، اسے ہشادیا جاتا ہے۔
رکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن پاکستان کو خصوصی رعایت حاصل ہے۔ اس لیے دارنگ دی جاتی ہے۔
اگراب بھی کوتاہی ہوئی تو کھال ادھیرہ دی جائے گی، اور ننک لگا کر دھوپ میں رکھ دیا جائے گا۔"
یہ من کو خوف سے میرا خون جنم گیا اور میں دلپانہ دار باہر نکل گیا۔ تین گھنٹے صاحب اور مرچ
اس کمرے میں بند رہے۔

جب صاحب باہر نکلے تو ان کا سخن زرد تھا، جیسے تمام خون چروں لیا گیا ہو۔ دل میشکل
چل رہے تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

دو سال بعد ایسی ہی نوچت کا ایک اور واقعہ ہوا۔ صاحب اور میں دوسرے پر کراچی
گئے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم سمندر جیل گئے۔ صاحب کو دہان کچھ کام تھا۔ ابھی وہ کام سے
فارغ ہوئے تھے کہ جیل کے ایک گارڈ نے اس کو سلوٹ مارا۔ بولا "حضور، ایک قیدی آپ کا نام
لے لے کر پکار رہا ہے۔ کہتا ہے اُسے بلاد"۔

ہم اس گارڈ کے پیچے پیچے چل پڑے۔ ایک چھوٹے سلاخ دار کمرے میں ایک ہمچڑا بند

تھا۔ صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ ”تالا کھولو“ صاحب بدلے۔ تالا کھلا تو وہ اندر داخل ہو گئے اور گارڈ سے بولے ”تم جاؤ۔“ گارڈ چلا گیا۔ میں اوت میں کھڑا رہا
ہیجڑے نے صاحب کو دیکھتے ہی چلا کر غصتے سے کہا ”تجھے خبردار کرنے کے لیے میں قید ہوتا پڑتا۔“

یہ سُنستے ہی تجھے رخوت طاری ہو گیا اور میں دلائ سے بھاگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب صاحب دلائ سے نکلے تو انہی دہی مالت بھی جیسے مرچ سے ملاغات کرنے کے بعد ہوئی تھی یا اللہ! یہ کیا اسرار ہے۔ میرے ذہن میں پھر سے ایک حکیمی سی مج گئی۔ اگلے روز میں اکیلا جل پہنچا۔ لیکن وہ قیدی دلائ نہیں تھا۔ میں نے ادھر ادھر سے اس کے کوائف پوچھے۔ پتا چلا کہ وہ باقاعدہ قیدی نہ تھا۔ جل کے قربی بازار میں دنگا کر رہا تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے لا کر کمرے میں بنڈ کر دیا۔ صاحب کے جانبے کے بعد اس کے کمرے کو مغلل کر دیا گیا تھا۔ کسی گارڈ کو علم نہ تھا کہ کس نے اسے رہا کیا ہے۔

ان واقعات نے مجھے پاک کر دیا۔ پاکستان کی امتیازی حیثیت کا بھید اور بھی پُرسار ہو گیا۔ لیکن ان جانے میں مجھے پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یقین ہو گیا۔ اور اللہ میں اپنے مشقت زدہ ہاتھوں سے پاکستان میں بھگ جگایاں گے رکھتے ہوئے نظر آنے لگے۔

پھر میرا تابادر ہو گیا اور میری خوبیات ایک اور جمکنے کو پیش کر دی گئیں۔ اس پر میں نے اعلیٰ کا سامن لیا۔ گاہے گاہے بیٹھے بھائے مجھے وہ دور یاد آ جاتا۔ میرے جسم پر چونتے سے ریکھتے اور ایک بھیب کیفیت مجھے اپنی آنکھ میں لے لیتی۔ سانپ گز رچا تھا لیکن لکیر یا تی تھی۔ اور وہ لکیر روز بروز روشن تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لکیر نے گویا نبڑ سی میرا زادی نے گاہ بدل کر کھدیا تھا۔ اس کے باوجود ذہنی طور پر میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا۔ میری کیفیت یہ تھی کہ نہ گھر کا نہ گھٹ کا۔ پاکستان کے لیے میرے دل میں خواخواہ عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ میں پاکستانی ہونے پر فرم ہموس کرنے لگا تھا، اور پاکستان کے مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھائے انتظار کر رہا تھا۔ کس کا انتظار ہے

یہ مجھے علم نہیں۔

ایک روز جب میں اسلام آباد کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا، ایک ٹسکسی میرے قریب آکر مرک گئی۔ میرے ایک پڑانے دوست احمد نے ٹسکسی سے سفر کلا۔ اسے دیکھ کر میں چلایا "اسے تو یورپ کئے ہوئے تھے؟" میں اسی پہنچتے واپس آیا ہوں "احمد بولا" یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "بری شاہ طیف جا رہوں" دہ بولا۔ احمد کی زبان سے شاہ طیف کا نام سن کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ احمد سندھ پ جدید کی پیداوار تھا۔ "تم دہل جا کر کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔ "آٹھیاڑ دہ بولا" میرے ساتھ چلو۔ ابھی واپس آ جائیں گے۔"

جب ہم مزار پر پہنچے تو فاتح خانی کے بعد احمد بولا "یار، بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا یہ لوگ اس قدر صاحبِ نظر ہوتے ہیں؟ ڈاکٹر ٹریٹ کے سلسلے میں یورپ کی مقصد دلائریوں میں لگا۔ دہل ایک نسخہ مل جس میں درج تھا کہ شاہ طیف نے رہ جانے لکھنے سوال پر فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک ایک اسلامی شہر آباد ہوگا جو دنیا میں اسلام کا مرکز بنے گا، اور یہ نسخہ دو ڈھانی سو سال پُکانا تھا۔ دیکھلو، اسلام آباد نور پور سے آدمیوں کے فاصلے پر ہے۔ صرف آدھ میل حصہ گئی۔" جب ہم نور پور سے واپس آ رہے تھے تو ٹسکسی مرک گئی۔ "کیوں بھائی، مرک کیوں گئے؟" احمد نے پوچھا۔ ڈرائیور بولا "جناب، نور پور کی سڑک یہاں سے توڑ دی گئی ہے۔" ہم نے باہر دیکھا۔ سڑک توڑی ہوئی تھی۔ دس پندرہ گز کا ٹکڑا کچا تھا۔ احمد نے تھقہ لگایا۔ بولا "دیکھ لومختی، اسلام آباد نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ بری شاہ طیف کو رہانے والی سڑک کاٹ دی ہے۔ اور یہ شہر دنیا میں اسلام کا مرکز بننے والا ہے۔" اس نے ایک اور تھقہ لگایا۔

"نور پور کے تانگے کو اسلام آباد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں" ڈرائیور نے کہا۔ "سُستے ہو؟" احمد بھر اسٹنے لگا۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ عجیب و غریب نوعیت کی خبریں آئے گیں۔ یہ تہرس مافق الغطرت عنصر سے بھری ہوئی تھیں۔ قدم قدم پہنچرات کے

تذکرے تھے۔ اخباروں کے کالم ایسے بیانات سے بھروسے ہوئے تھے۔ لوگ ان خبروں کو سُستہ اور سرد ہٹتے تھے۔

متعدد لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ حضور مسیح درود عالمؐ عجلت میں گھوڑے پر سوار ہو کر پاکستان تشریف لارہے ہیں۔ جنگ بدرا کے شہدا محاذوں پر پیغام چکے ہیں۔ حضرت علیؓ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ سفید طیوب سات پہنچ سیالکوٹ کے قرب وجرام میں محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ ایک محاذ کے بھارتی قیدی کا بیان تھا کہ سفید پیر اہم و ایسی پاکستانی فوج بھارتیوں کو تھس بخس کر رہی تھی۔ ان کی تلواروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دُسرے محاذ کے قیدی کا بیان تھا کہ سرخ ٹوپیوں اور چبٹے قدوالے پاکستانی فوجیوں نے بھارتی سینا کا ناظم بند کر رکھا تھا۔ بھارتی تو پچھے نے کہا کہ گورے چینکنابے کا رہے۔ ایک سفید ریش بدھامیرے گولے کیج کر کے پرے چینک دیتا ہے۔ بھارتی ہوا بازوں کا بیان تھا کہ جب دُ گولے چینکتے تھے تو سفید ریش بدھھے انہیں ہاتھوں میں پکڑ کر زمین پر یوں رکھ دیتے کہ وہ بچلتے نہ تھے۔

سارا پاکستان ان مجرماں تذکروں سے گوچ رہا تھا۔ ایک دانشور نے تحقیر بھرا تھقہ لگایا یا رہ، یہ پاکستانی خام مجرم سے گھرنے میں مکال رکھتے ہیں۔ آج کل ایسا ایسا مجرم۔ ایجاد ہو رہے ہے جس کا جواب نہیں۔

”لیکن _____“ دوسرے بولا ”یا راگ ان مجرموں سے ہٹ کر حقائی کی روشنی میں بات سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات بننی نہیں“
”کیا مطلب ہے“ تیسرے نے کہا۔

”مطلب یہ کہ اگر حقائی کی روشنی میں دیکھا جائے تو _____ ہیں جنگ ہار جانی چاہیے تھی اور بھارت کو پاکستان پر قابض ہو جانا چاہیے تھا۔“

”بلاء“ ایک اور دانشور بولے ”بھارتی حملے کا پلان فوجی اصولوں کے لحاظ سے عین پریکٹیکل تھا۔ اس میں کوئی سبقت نہ تھا۔“

”یکن یہ مافوق الغطرت داستانیں چھوڑو، یا“ ایک نے کہا ”غالص جدت طرازی“ دہ قسمہ مار کر ہنسا۔

”یکن یا“ ایک روپر ٹریلہ ”و دیک باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں“ ”دوسرا ایک باتیں ہر کسی نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں“ پہلے دانشور نے تعمیک بھرا قسمہ لگایا۔ میں ان کی باتیں خود سے من رہتا ہیں لیکن مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان سب کے دلوں میں بار بار ایک ہی خیال اجھرتا ہے۔ اور وہ اسے بھروسے کے لیے دیلوں / قسموں کا سہارا لے رہے ہیں۔

جنگ نے پاکستان کے متین کو از مر نو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن اب مجھ میں مُفاغعت کی طاقت نہ رہی تھی۔ اب مجھ میں اس بات کو شدت سے روکرنے کی ہمت نہ رہی تھی جسے میں اپنی عقل و خرد کے مطابق سمجھوئیں سکتا تھا۔ جنگ کے دوران ان میزرا العقل بالتوں نے پاکستان کی امتیازی حیثیت پر ہرگاری تھی۔ اب میراللہ سٹول پر پیچھہ کرائیں نہیں سکھ رہا تھا۔ وہ سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ماخی میں ایک لمبی ذہنگ آئندگوار تھی۔ وہ پاکستان کے محاذوں پر گشتم کر رہا تھا، اور اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔

جنگ کے دوران میرا نیک ہم کا رجھ سے ملنے آیا۔ ملاقات کے بعد میں نے پوچھا ”کیا کھڑا گئے؟“ بولا ”نمیں۔ قاضی صاحب سے مل کر کھڑا گا۔“ میں نے پوچھا ”وہ کون ہیں؟“ بولا ”دہ ایک عابد آدمی ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔“ میں نے کہا ”مجھے بھی ساختے چلو۔“

قاضی صاحب کے کمرے میں جا بجا کر مدیرہ کی تصادر یا اوریزاں تھیں۔ جائے نہ ز پر تیسیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے ”آپ بھی کوئی بات کریں۔“

”میں نے کہا ”بھی، پاکستان کے لیے دعا فرمائیں۔“

ذفتاً وہ سخنیدہ ہو گئے۔ بولے ”میں بہت چھوٹا آدمی ہوں، بہت ہی چھوٹا آدمی ہوں۔“

میری کیا حیثیت ہے کہ میں پاکستان کے لیے دعا کروں۔ نہیں جناب، میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں،“
میں نے کہا ”جناب قائمی صاحب، دعا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔“

دہ بولے ٹھیک ہے، لیکن پاکستان کی اور بات ہے۔ آپ کو پتا نہیں، مجھے بھی محتذی
سی خبر ہے، بہت محتذی۔ میں چھوٹا آدمی ہوں، بہت چھوٹا۔ پاکستان پر بڑوں کا ملختا ہے۔ دہ
پاکستان کے محافظہ ہیں۔ اس کے نگہبان ہیں۔ آپ پاکستان کی فکر نہ کریں ॥

قائمی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بڑوں کے چھتے کو پھر سے پھر دیا۔
یا اللہ یہ بڑے کون ہیں؟ کیا دہی ہیں جو جہاد میں شامل ہونے کے لیے عجلت سے گھوڑے
پر سوار ہو رہے تھے۔ کیا دہی ہیں جو سیاکوٹ کے گرد دنواح میں سفید پیرا ہن پہنے دیکھے
گئے تھے؟

کیا یہ دہی تھے جو بھارتی توپوں کے گولے کچھ کرتے تھے؛ ہوا نی جہازوں سے گرانے
ہوئے بجوس کو اٹھا کر دُور پھینکتے تھے؟ کیا انہی بڑوں میں سے کسی نے بھارتی پانکٹ کی
نظر پندری کر دی تھی اور اسے دریائے راوی پر چھپل نظر آنے لگے تھے؟ کیا انھوں نے بھارتی پانکٹ
کو حکم دیا تھا ”بیل آڈٹ، بیل آڈٹ“ اور وہ پاکستانی مراحمت کے بنیز بڑوں کی آوازیں سن کر گزر کر
بیل آڈٹ کر لیا تھا؟

کیا پاکستان کے بیڑوں کا اس بات کا شور تھا کہ بڑے قدم قدم پر پاکستان کی اولاد کر رہے
ہیں؟ کیا انھوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ پاکستان کی مثالی ترقی میں ہماری جدوجہد کو ان نتائج سے
پکھ مناسبت نہیں جو بظاہر ہماری کوششیں پیدا کر رہی ہیں؟ کیا انھیں اس حقیقت کا شور ہے
کہ بین الاقوامی سطح پر جو امتیت پاکستان کو حاصل ہے وہ کس کی مرہوں منت ہے؟ کیا پاکستان کے
سربراہوں کو کبھی شک پڑا ہے کہ پاکستان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے؟ اور کیا انھوں نے اس
بات کی عملی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی کشتی کو کھٹے کر اس امتیازی حیثیت کی طرف لے جائیں؟
کیا انھوں نے ان بڑوں سے رابط پیدا کرنے کی خواہش محسوس کی ہے جو پاکستان کی فلاخ و سبدود اور

اس کے تخفیف کے لیے ہم صرف عمل میں ہیں؟

"لوں _____" قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوتی بھروسوں کے چھتے کو پھر سے

چھیرا دیا تھا۔

جنگ ختم ہو گئی لیکن بھروسوں کا چھتا ابھی تک بھن کر رہا ہے۔

قبرستان کے قریب ایک ننگ دھڑانگ مست اپنے آپ سے کہ رہا تھا "ابھی کیلیہے۔

ابھی تو غن کی ندیاں بہیں گی۔ بہت مریں گے، بہت۔ لاشیں ہی لاشیں۔ پھر رہائی فتح ہو گی۔ پھر

برطی فتح ہو گی۔ اور پھر سمعان اللہ! سمعان اللہ! وہ جوش میں تالیاں بجا رہا تھا، جیسے مجھے چڑا رہا ہو۔

خواجہ صاحب کو مزار پر فاتح پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رُک گیا۔

"کیا حال ہے، مفتی صاحب؟" وہ بُرے۔

"فلکیں گھل رہا ہوں، خواجہ صاحب" میں نے کہا۔

"کس کے فلکیں گھلنے لگے؟" انہوں نے پوچھا۔

"پاکستان کا فلک رکا ہے" میں نے کہا۔

وہ سنبھیدہ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر خفتے کے اثرات تھے۔ بُرے مفتی جی، اللہ کا کام اللہ پر چھوڑ

دُو۔ اللہ کا کام اپنے ذستے دُلو۔ پاکستان کا فلک رکنے والے آپ کون ہیں؟ جی؟ آپ اپنی سوچ جیسے۔

اپنی ٹکر کیجیے۔ وہ مفتی جی! اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ سکے؟"

چلتے چلتے میں نے جو سُلطھا کر دیکھا تو اس نے مانوس نظر آیا میں نے اسے اہمیت نہ دی اور چلا

رہا لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گی توں توں یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں عطفی سے کسی ان جانی سڑک پر نکل آیا

ہوں۔ میں نے سوچا کوئی راہگیر ملے تو اس سے پوچھوں کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ پچھلے دری سڑک سے ہٹ کر

ایک بہت بڑا بڑا درخت تھا جس کے قریب ہی گھاس بچوں کا ایک جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک شخص کھڑا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص سے پوچھ لواں۔ جھونپڑے کے بلا بہنچا تو سیئی سی بینخنگی آزاد آئی اور سکوڑ کے پچھلے پہنچتے کی ہوا نکل گئی میں نے سکوڑ روک لیا۔ کی مصیبت ہے، میں نے سوچا اب فالتو پہنچیہ فٹ کرنا پڑے گا۔ سٹفنی کو دیکھا تو اس میں بھی ہوا نہیں تھی۔ اب کیا ہو گا، میں لگھرا گیا۔

میں نے سر اٹھا یا تو روبرو ہی وہ شخص کھڑا تھا جسے میں نے جھونپڑے کے سامنے دیکھا تھا۔

”کیا ہمارا؟“ اس نے پوچھا۔

”پنکھہ موگیا ہے۔“

”اسے ادھر کھڑا کر دے نا“ وہ بولا۔

”یہ سڑک کھڑک کو جاتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کہیں بھی نہیں جاتی“ وہ بولا۔ ”ادھر پہنچنی کے نیچے جا کر ختم ہو جاتی ہے۔“

”آس پاس کوئی گاؤں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں“ وہ بولا۔ ”ادھر ایک رکھے ہوں سے کجھ بھی ٹرک آتا ہے۔ تو یہاں دھوپ میں کیوں کھڑا ہے، جھونپڑے میں جا کر بیٹھے۔“ اس نے کہا۔ ”میں سکوڑ کا دھیان رکھوں گا۔“ جھونپڑے میں چٹائی بھی ہوئی تھی۔ ایک گوتے میں چادر سی لپٹی پڑی تھی۔ دوسروے کو نئے میں پانی کا کھڑا تھا، ساٹھ ہی میں کا ڈنہ پڑا تھا۔ میں نے پانی پیا اور پھر دروانے کے سامنے بیٹھ گیا۔

چار دنیں حرکت ہوئی اور ایک دُبلا پلا سفید ریش چہرہ نکلا ہوں۔

”اٹھتے ہی بولا“ تو آگیا۔

”جی“ میں نے جواب دیا۔ ”میں راستہ بھوگوں کر ادھر آنکلا ہوں۔“

”ہاں“ تھھا بڑا بڑا۔ ”جب جاہتے ہیں راستہ دے دیتے ہیں جب چاہتے ہیں میں راستہ بدر کر دیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”جی، میرے سکوڑ کی ہوا نکل گئی ہے۔ پنکھہ موگیا ہے۔“

ملن" دہ بولا "ہم خود میں ہما محبت رہتے ہیں۔ ان کا کرم ہو جائے تو ہمارا نکل جاتی ہے۔" پہلے تو میں اس کی بالوں پر چھٹھ کا پھر سوچا کوئی مخذوب ہے جو اناب پشاپ بول رہا ہے۔ پھر دیر کے لیے وہ چھپ رہا پھر مضم آواز میں بولا "تو جو نئے بست بنارہا ہے کیا تجھے قلم اس لیے دیا تھا کہ بست بنائے؟" قلم کی بات سن کر میں چڑکا۔ اسے کیسے پتا چلا کر میں لکھتا ہوں لیکن بست، بست تو قلم سے نہیں بنائے جاتے۔

غمزہ وہ تباہ جوش میں آگیا۔ کہنے لگا کیا چیزیت ہے پاکستان کی۔ ایک چھٹا چھٹنی سا ملک۔ غریب ملک۔ نہیں میں نہ تیرہ میں ڈا دکھ دیر کے لیے چھپ ہو گیا۔ پھر آپ ہی چھڑا گیا۔ اور یہاں کے لوگ۔ چاروں طرف سے میں میں کی آوازیں آتی ہیں بکرے میں میں کر رہے ہیں۔ کھلتے جا رہے ہیں، کھاتے جا رہے ہیں اللہ کی اس دی ہوئی دیگ کو کھاتے جا رہے ہیں۔ ساٹھ پانپا کٹورہ پھر سے جا رہے ہیں اپنی اپنی کوٹھالی میں دلنے ڈالنے جا رہے ہیں۔ ضرورت نہیں۔ طبع خالص طبع۔ دُعسرے پاہے بھوکے مریں۔ پڑے مریں۔ بیری کوٹھالی پھر جائے۔ کوئی ملک کا نہیں سوچتا۔ کوئی قوم کا نہیں سوچتا۔ کوئی دین کا نہیں سوچتا۔ آخوت کا نہیں سوچتا۔ بس اپنا حصانی پڑی ہے۔ بادشاہ بھی میں کہدا رہے۔ نقیر بھی میں میں کردا رہا۔ بلیاں چھپڑوں کی رکھوائی پڑی ہیں۔ اس ملک کو تم بست بنارہے ہو۔ خوشیاں دے رہے ہو۔ یہ ملک تو اس لائی ہے کہ غرق کر دیا جائے۔ تجھے؟ اس نے مجھے ڈانٹا۔ غصتے پھری زگاہ مج پر ڈالی۔ بول کیا کہتا ہے؟ کیا تجھے اس لیے قلم دیا تھا کہ اس ملک کے قصیدے لکھے؟ بول؟ وہ چلتا یا۔

میں سرفراز سے بیٹھا رہا۔ سمجھ بیٹھا ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ دیر تک وہ خلوش بیٹھا رہا۔ پھر بولا:

"حرس ہی حرس۔ طبع ہی طبع۔ اتنے حرس ہو گئے ہیں کہ اپنی غرض کے لیے اللہ کا نام بیچنے لگے ہیں۔ اسلام کو بیچنے لگے ہیں۔ اسلام کو دادا پر لگا رہے ہیں۔ اللہ سے تحول کر رہے ہیں جس بڑوں کا یہ حال ہے تو ہجیوں کا کیا ہو گا۔ اور تو کہتا پھر تاہے اس ملک بیراللہ کی رحمت ہے جہاں

اللہ کا نام ملکے ملکے سیک رہا ہو۔ اتنی ناقری توبہ ہے! توبہ ہے! اللہ کی ناقری۔ دین کی ناقری۔ وہاں رحمت ہوگی کیا؟ بول۔ پھر وہ غصتے میں چلکنے لگا۔ تجھے یہاں اس یہ نہیں بلا یا ہے کہ نہیں میں گھنگھیں ڈال کر بیٹھا ہے؟

”مجھے بلا یا ہے؟“ میرے مخدوس سے بے اختیار زکلا۔

”اور کیا تو خدا آیا ہے یہاں؟“ وہ بولا، یہیں یہاں تیرا انتظار کرتا پڑا۔ ہمیں پتا تھا کہ تو آئے گا اور تو آیا؟“

”لیکن میر کیا تصویر ہے بابا؟“ میں غصتے میں آگی۔

”ہاں تیرا قصور ہے“ وہ بولا جن بالوں کو تو نہیں سمجھتا، نہیں جانتا، ان کے بارے میں کیوں بات کرتا ہے؟ بیکوں اللہ کی خلقت کو مگر اکرنا تھا ہے؟“

”میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں جانتا ہوں۔ میری تو کوئی حیثیت نہیں بابا“
میں نے جواب دیا۔

”جو تو بے حیثیت ہے تو بے حیثیت بن کے رہ۔ بہتی باتاں نہ بگھا۔ شیخیاں نہ مار۔ پر تو بھی ان جیسا ہے وہ اپنی بات بنانے کے لیے اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے اسلام کا نام برت رہے ہیں تو اپنی حیثیت بنانے کے لیے پاکستان کی وڈیاں لیکی باہیں کر رہا ہے۔“

”غلط ہے، بالکل غلط“ غصتے سے میری پہنچیاں بخجے گئیں ”میں تو صرف وہ باتیں لکھ دیتا ہوں جو تمہارے جیسے بادشاں کی زبانی سُنتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی طرف سے بات نہیں کی۔ میں نے کبھی بٹھا چڑھا کر بات نہیں کی۔ میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں جانتا ہوں۔ تو بتا کیا لا مل پورے اس بلے نے مسجد میں جھوکی نماز کے بعد دعا اڑھائی سو لوگوں کے سامنے نہیں کہا تھا کہ ایک دن آنسو والہ ہے جب یہاں ہر قدم اٹھانے سے پہلے پاکستان سے پوچھے گی کیا یہ قدم اٹھانے کی اجازت ہے اور انہوں نے کہا تھا اگر ایسا نہ ہوا تو تم اگر میری قبر پر محکم کن۔ بتا کیا اس بابے نے مجموعت بول لاتھا؟ بول بابا۔ چپ کیوں ہو گیا؟ وہ دیر تک سر جھکانے بیٹھا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہنے لگا ”نہیں، وہ بابا مجموعت نہیں بولتا۔“

”کیا فریضہ کے بابے نے اٹھائی سو سال پلے نہیں کہا تھا کہ یہاں ایک اسلامی شہر آباد ہوگا
 جو عالمِ اسلام کا مرکز بنے گا؟“
 ”کہا تھا“ اس نے کچھ تو قف کے بعد کہا۔
 ”کیا وہ صدیوں سے بابے یہ کہتے نہیں آرہ ہے کہ ایک دن آئے والا ہے جب ہند میں
 اسلام کا ڈنکا بجھے گا؟“
 ”وہ خاموش بیٹھا رہا۔

”کیا مریضہ کے بابے جس کے حضور مجھے بھیجا گیا تھا، قیامِ پاکستان کے وقت شاہِ دکن کو دعوت
 نہیں دی تھی کہ آج یہ شہنشاہِ ہند بنادیں۔ کیا دکن کے سی این سی پندری میں اُگر بابا سے نہیں ملے تھے؟
 بابا نے نشانہ ثانیہ کی خبر ز سنائی تھی۔ پاکستان کی مرکزی حیثیت کی بات نہیں کی تھی، بتا“ میں غزاریار
 ”تو نہیں سمجھتا“ وہ بولا۔ بزرگوں کی باتیں برقی ہیں۔ لیکن تجھے میں سمجھ کی کی ہے۔ تو ان کی بات
 کے مرح کو نہیں سمجھتا اور انھیں اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی
 ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دیکھو“ وہ تو قف سے بولا۔ پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں،
 کچھ حیثیت نہیں۔ ایک چھوٹا سا عام سا غریب ملک۔ ساری اہمیت اللہ کے دین کی ہے۔ وہ دن
 آئے والا ہے جب اللہ کے دین سے دُنیا منور ہوگی۔ اور اللہ کا بھیجا ہوا وہ بندہ جس کے وجود سے
 دُنیا منور ہوگی پاکستان میں آئے گا۔ ان کا قیامِ پاکستان میں ہوگا۔ انشاء اللہ پاکستان کی عظمت ان
 کے قیام سے والبستہ ہے۔ بذاتِ خود نہیں۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

پھر تڑپ کر بولا۔ ”دیکھو صدری نہیں کرو وہ صاحب پاکستانی نژاد ہوں۔ کیا پتا کرو وہ یورپ
 کے ہوں یا افریقہ کے ہوں یا کہیں کے ہوں۔ البتہ ان کا قیامِ پاکستان میں ہو گا۔ اور یہ پاکستان کی بہت
 بڑی خوش قسمتی ہے، دُنیا بھی ہے۔ دیکھو“ وہ بولا۔ کوئی بابا ہمی بات نہیں کر سکتا۔ کسی کو جزا نہیں کرو وہ جمی
 بات کرے۔ وہ قادرِ مطلق ہے جو چاہے کرے آخری فیصلہ اس کے لایتھیں ہے۔“
 ”وہ خاموش ہو گی۔ پھر کچھ دری کے بعد بولا۔ آئندہ سے بڑوں کی باتوں پر قلم نہیں اٹھانا۔ سمجھا؟“

اس نے مجھے ڈانٹا۔ پھر وقت کے بعد صیمی آفیز میں بولا "ہم تھیں دو نفظ دیتے ہیں، ان کا اور دکترتے رہنا۔" قریب پڑھے چند کاغذات سے اس نے کاغذ کا ایک لکھا ڈھانٹا۔

"میں پاک حالت میں نہیں رہ سکتا" میں نے کہا۔

"کچھ پڑھا نہیں" وہ بولا۔

"میں عربی نہیں پڑھ سکتا" میں نے کہا۔

"اچھا" وہ رُک گیا۔ پھر بولا "ٹھیک ہے" اور کچھ لکھنے لگا۔ لکھنے کے بعد اس نے کاغذ کا ملکٹا ایک پُرانے لفاف نے میں ڈالا اور وہ لفاف مجھے پکڑا دیا۔ کہنے لگا "گیارہ مرتبہ صبح اور گیارہ مرتبہ سوتے وقت اس کا اور دل کیا کر۔ اب تو جا الٰہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا کرے؟"

میں اٹھ یعنی۔ باہر میرا سکوڑ سڑک کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے سکوڑ اسٹارٹ کیا اور چل پڑا۔

کچھ دور جا کر دفتر مجھے یاد آیا کہ میرے سکوڑ کا پہتیا تو پہنچ ہتا۔ میں سکوڑ روک کر نیچے اٹا۔

پہتیے کو دیکھا۔ ہوا ٹھیک ٹھاک تھی۔ پھر میں نے ستھنی کو دیکھا وہ بھی ہوا سے بھری ہوئی تھی۔ یہ کیسے ہوا ہے جو پر حیرت طاری ہو گئی۔ درستک اسی عالم میں چلتا رہا، چلتا رہا۔ پھر جونگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ مراستہ ہاؤں تھا۔

ساری رات میں سوچتا رہا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ شام کو میں پھر سکوڑ کے کرچل پڑا تاکہ اس

سڑک کا پتا لگائیں جس پر میں غلطی سے مر گیا تھا۔

کچھ دریتلاش کرنے کے بعد وہ سڑک مل گئی۔ میں اس پر چل پڑا۔ بڑے کے درخت کو دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی لیکن بڑے کے آس پاس جھوپڑا دکھائی نہ دیا۔ بڑے کے نیچے ایک کدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے پوچھا "یہاں ایک جھوپڑا اچھا؟"

"جھوپڑا؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "نہیں" وہ بولا "یہاں کوئی جھوپڑا نہیں"۔

"تو ادھر کب آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بالے میں رکھ میں کام کرتا ہوں۔ موز ادھر سے گزرتا ہوں۔ دوبارہ۔ میں نے کبھی کوئی جھوپڑا

نہیں دیکھا۔"

"میں کل آیا تھا" میں نے کہا "بڑھی دیر اس بھوپرے میں بیٹھا رہتا تھا" اس نے حیرت سے
میری طرف دیکھا جیسے میں پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا ہوں۔
یہ دفعہ اس نہایت کا ہے جب پہلی مرتبہ میں نے پاکستان پر صفوں لکھا تھا۔ اسے شائع ہوئے
ایک ہمینہ گزرا تھا۔

میں ایک مخزن بانی مسلمان ہوں۔ میری زندگی عمل سے یکسر خالی ہے۔ میری زندگی میں چار
ایک ایسے واقعات ہوئے ہیں جنکی بست کر مجھے پتا پلا کہ ہماری دنیادی زندگی کے مقابلے ایک روحانی
نظم بھی چل رہا ہے۔

میکن بنیادی طور پر میں ایک ادیب ہوں، دانشور ہوں۔ میرا باطن شکوک و شبہات سے اٹا پڑا ہے۔
ایسے واقعے سے میں چند ایک روز متاثر ہوتا ہوں، چھپنکر ہو جاتا ہوں۔

چند ایک روز میں سوچتا رہا چھپنکوک و شبہات نے گھیر لیا۔ سوچا شاید میں نے خواب دیکھا
ہو ریا شاید وہ بھوپرہ اور وہ بورڈھا میرے ذہن کی اختراض ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سڑک پر اکنے
جانے والوں نے وہ بھوپرہ ان دیکھا ہو۔ صدر ریمیرے ذہن کی اختراض ہوگی۔ یوں میں نے خود کو مطمئن اور
محفوظ کر لیا۔

چھروں ایک ماہ کے بعد میں نے اپنی واسکٹ کی اندر ورنی جیب میں لاتھو ڈالا تو ایک مڑا اڑدا
لغافہ برآ مر ہوا۔ اس میں کافذ کا ایک ٹکڑا تھا، اور بسم اللہ کی ہر ہی تھی۔ یونچے لکھا تھا: گیارہ بار بیج
جلگتے وقت اور گیارہ بار رات سوتے وقت ورد کر د۔ اس کے نیچے لکھا تھا: چھوٹا منہ بڑی بات۔

حضرت مہر ہومیو پلیٹھنی کے نام

مدیر اعلیٰ ماہنامہ ہومیو پلیٹھنی کے نام ایک خط

مکری جناب عطا حسین کلیم صاحب
السلام علیکم

گزشتہ چھ ماہ سے میں آپ کا پرچہ باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ لیکن آج تک میرے پڑک
نہیں چلا ہوا سے باں ایک مثل مشورہ ہے ”آب آب کر مولیں بچ فارسیاں گھر گائے“ آپ کا پرچہ سلسلہ
آب آب کر رہا ہے۔ پانی کی بات نہیں کرتا۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ کے پرچے کی بند اکڑوں۔ آپ کا پرچہ ماشا و اللہ بڑے بڑے
عالما نہ اور محققانہ مصنایں پیش کرتا ہے۔ ملک بماریوں کے متعلق معلومات بھم پہنچاتا ہے۔
نادر دویات کے خواص گذاتا ہے۔ یہ ہدایات قلم بند کرتا ہے کہ مریض کی کیس سہی طریقے نہ سط
کی جانی پاہے۔ اس بات پر بحث کرتا ہے کہ کون سی سمبلوں میں کون سی پٹسٹنی استعمال کرنی چاہیے۔
کون سی سٹیمز کو اہمیت دینی چاہیے۔ کون سی کو درخواست اتنا نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ تمام باتیں عالمہ
ہیں تحقیق و سحر بے کا پھرڑیں۔ لیکن یہ سب باقیں ہومیوڈاکٹروں کے لیے کام کی باتیں ہیں۔
عام قاری کے لیے ان کی حیثیت آب آب کی ہے۔

جناب کلیم صاحب، صرف آپ کا پرچہ ہی نہیں، یہاں پاکستان میں ہومیو پلیٹھنی کے
مصور عرض پر جتنے پرچے بھی شائع ہو رہے ہیں، ان سب میں عالما نہ اور محققانہ باقی ہوتی ہیں جو

صرف ہو میوڈاکٹروں کے لیے اہمیت رکھتی ہیں اور مجھ سے عام قاری کے لیے آب آب کی
چیزیں رکھتی ہیں۔

کلیم صاحب، کیا یہ پرچہ آپ نے اس لیے جاری کیا ہے کہ یہاں کے ہومیو پیٹھ ایک
دوسرا سے کے تجربات سے مستفید ہوتے رہیں یادہ اپنے نام کا جھنڈا لہرانے کے لیے عالماء کتابی
چیزوں شائع کرو سکیں؟ اگر یہ درست ہے تو یقیناً آپ دورِ جدید کے حاصل طالی نہیں جو دوسرے
کے مقابل کے لیے اپنا مال اور وقت قربان کر رہے ہیں۔ ایک بات تو ظاہر ہے کہ ہومیو پیٹھ ڈاکٹر
آپ کا پرچہ نہیں خریدیں گے۔

میں ایک ادیب ہوں۔ میں نے کبھی ادبی پرچہ نہیں خریدا۔ میں یہ موقع رکھتا ہوں کہ
ادبی پرچوں کے مُدیرِ مجھے اپنا پرچہ صفتِ صحیعیں گے اور وہ صحیح ہے میں۔

اسی طرح ہومیوڈاکٹر آپ سے پرچہ نہیں خریدیں گے۔ وہ موقعِ رکھیں گے کہ آپ
اُن کو اپنا پرچہ اعزازی طور پر بخیعیں۔ اگر یہ پرچہ ہومیو پیٹھ ڈاکٹروں کے لیے جاری کیا گیا ہے
اور ہومیوڈاکٹر خریدتے نہیں تو جناب کلیم صاحب، یہ فرمائیے کہ اس پرچے کو کون خریدے گا؟
میں تو نہیں خریدوں گا۔ اس لیے کہ یہ پرچہ میرے لیے تو غالباً آب آب ہے۔ اس کے
مندرجات عام قاری کے لیے نہیں ہیں۔

کلیم صاحب، آپ تو بنیادی طور پر ادیب ہیں۔ آپ ادبی پرچوں کے متعلق واقعیت
رکھتے ہیں۔ آج کل ادبی پرچہ نکالنا ایک عیاشی ہے۔ کچھ سرچھے لوگ اس عیاشی کے ترکب
ہو جاتے ہیں۔ ادبی اور ہومیو پیٹھی پرچوں میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ کہ دونوں کے خریدار
نہیں ہیں۔

پُرانی بات ہے، پاکستان میں ایک جرمن ادیب تشریف لائے۔ انہوں نے راولپنڈی
کے ادمیوں کو اکھڑا کیا اور انھیں سخت ڈاٹ پلائی۔ کہنے لگے کہ آپ اپنی تخلیقات کو عالمی ادبی
اور قارئین کے سامنے کیوں نہیں پیش کرتے؟ دیکھیے میں جسمی سے چل کر یہاں آیا ہوں تاکہ پاکستانی

ادب سے دُنیا کو رُد شناں کر لائل۔ اس ڈانٹ کے جواب میں پاکستانی ادیبوں نے آئیں بائیں
شایئں کی۔ سچی بات کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میں نے جرمن پروفیسر صاحب سے کہا کہ جناب واللہ ہم پاکستانی
ادیبوں کی ایک پرالبم ہے۔ ہم پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لہذا ہم معادھن سے خود
ہیں۔ ہم شوقیہ اللہ دراسٹے ادب لکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادبی پرچے نہیں چلتے۔ کچھ ایسی ہی
کیفیت ہو میو پیجی کے پرچوں کی ہے۔

دلیے جویں گلیم صاحب، آپ کو علم ہے کہ پرچے پکری کے زور پر نہیں چلتے۔ اشتہاروں
کے زور پر چلتے ہیں۔ اور آپ کے پرچے میں غذہ کے فضل سے کوئی اشتہار نہیں ہوتا۔ اور
جمان تک میں آپ کی طبیعت سے واقع ہوں، آپ کبھی اشتہار حاصل نہیں کر سکیں گے۔
آپ آئیے ایک سمجھیدہ مسئلے پر غور کریں۔ آپس کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ہو میو پیجی
کے سامنے کون سا ایسا مسئلہ درپیش ہے جو اہم ترین یقینت رکھتا ہے۔

اس وقت یقیناً یہ مسئلہ اہم نہیں کہ کیا ہو میو پیجی حیاتیں کو مانتی ہے۔ یہ مسئلہ جویں اہم
نہیں کہ کیا سہنگل ریڈی صفری ہے یا مرکبات کو جویں موقع دیا جائے۔ یہ مسئلہ جویں اہم نہیں
کہ چھوٹی پوٹیں یا نیادہ نزد اثر ہیں یا اور پی پوٹیں یا۔ میں مانتا ہوں کہ دلیے تو یہ سب
مسئلے اہم ہیں، لیکن اس وقت ان کی یقینت ضمی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت کیا صورتِ حال ہے؟ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنی
بات تفصیلی طور پر بیان کروں۔

ہمارے ہاں اس وقت صرف ایک طریقہ علاج مردج ہے۔ یہ طریقہ علاج ”پاک
بزنس“ کے لا تھوں میں ہے۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے اس طریقہ علاج کو فیشن میں پرالی دیا
ہے۔ سٹیس کا نشان بنادیا ہے۔ پس سچیں بنادیا ہے۔

آج کے بزنس نے چیز کو رانچ کرنے کا ایک الٹکھا طریقہ دریافت کیا ہے۔ مثلاً

کسی مشروب کو رائج کرنا مقصود ہے تو اشتہار کے ذریعے آپ اسے سٹیشس کا نشان بنا دیں۔ یہ نہ کہیں کہ کوک ایک فائدہ مند مشروب ہے بلکہ کہیں کہ وہ لوگ کوک پیتے ہیں جنہیں امتیاز حاصل ہے۔ مثلاً پی آئی اسے اشتہار دیتا ہے : باکمال لوگ لاجواب پر واد اس محلے کی وجہ سے پی آئی اسے میں سفر کرنا عزت کا نشان ہو گیا ہے۔ سٹیشس کا نشان بن گیا ہے۔ بگ بنسن نے الیوپھیک دوائیاں کھانے کو سٹیشس سمبل بنادیا ہے پہنچات بڑے اہتمام سے طرح طرح کی گولیاں کھاتی ہیں۔ ڈرائنس رومن کی میز پر گولیوں کی بوئیں قرینے سے لگی ہوتی ہیں تاکہ آتے جاتے لوگ دیکھیں یہ دنما نہ ہیں۔ یہ سالٹس ہیں۔ یہ ٹونک ہیں۔ یہ گولی معدے کو ٹھیک ٹھاک رکھتی ہے۔ ایسٹرٹی کو دُور کرتی ہے۔

پُرانے زمانے میں ڈاکٹروں کی دکانوں پر مفرد دوائیاں بوتوں میں رکھی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹرنگوں میں مفرد دوائیاں لکھا کرتے تھے۔ دوائی کا نام اور اس کی مقدار سب درج ہوتے۔ ڈاکٹروں کے کپاؤنڈر ادویات بناتے تھے۔ ایک ایک دوا کو مریٹری نگ لگاں میں ڈالتے، ناپنے، چھپ لوتیں میں ڈال دیتے۔ یعنی کپاؤنڈر دوا کو ڈسپن کیا کرتے تھے۔

اگر یہ طریقہ کار جاری رہتا تو کار دبار دوا ساز کمپنیوں کے ہاتھ میں نہ آتا۔ لہذا دوا ساز کمپنیوں نے بڑی محنت اور چالاکی سے مفرد دواؤں کا رداچ ختم کر دیا۔ اس کی جگہ تیار شدہ مرکبات بنادیے اور لوگوں کا ردبار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ادویات کے بگ بنسن نے ایک بہت بڑا ایزا پایا ہے کہ آج کے دور میں لوگ افادہ چاہتے ہیں۔ جھٹ پٹ افاقت۔ ابھی ابھی ٹھیک کر دو تاکہ شام کی ہصوفیات میں خلل نہ آئے۔ کیوں ریاضفا کے متعلق بچر کھی فرست میں سوچیں گے۔ اس لیے انہوں نے زیادہ تر توجہ افاقت بخش ادویات پر سر کو زکر دیا ہے۔ گولی کھاف۔ ٹھیک ہو جاؤ۔ کیوں کی طرف توجہ کرنا گھائی کا سودا ہے۔ افاقت کے تحت آپ روز گولی کھائیں گے۔ جب تک جیئں گے، کھاتے رہیں گے۔ لہذا گولیاں زیادہ بکیں گی۔ ظاہر ہے کہ برنس کے

نقطہ نظر سے افادہ بخش ادویات بنانا زیادہ منفعت بخش ہے۔ اس درجہ سے بگ بزنس نے کیوں کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ان کا مقصد صحت نہیں، کاروبار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایڈیٹیٹھی ایم جنسی کا سسٹم بن کر رہ گیا ہے۔ اور بیشتر عارضوں کی دوا سے آج تک حرمہ ہے۔

ایم جنسی کے علاوہ ایڈیٹھی سر جری میں بڑی حمارت رکھتی ہے۔ اس لیے جس عارضے کی دوا موجود نہیں اُسے آپریشن سے ٹیک کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ آپریشن دراصل ادویہ کے نقصان کی دلیل ہے۔ اس بات پر آج تک پرداہ پڑا رہا ہے کہ ایڈیٹھی ادویہ میں تلاش ہے۔ اس کے پاس بہت سے امراض کی دوا سرے سے موجود ہی نہیں۔ اب صورت حال کچھ بدلتی رہی ہے۔ لوگ محسوس کرتے لگے ہیں کہ ایڈیٹھی میں ہر مرض کی دوا موجود نہیں۔

اللہ پاکستانی ڈاکٹروں کا بھلا کرے۔ انہوں نے انہاد حصہ اُٹی بائیوکس دے دے کر لوگوں کو چونک کر دیا ہے۔ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے ہیں۔ بہت سے مریض ایسے ہیں کہ انگریزی دوائیاں کھا کھا کر ان کے روی ایکشنز کی وجہ سے مستقل مریض بن چکے ہیں۔ کچھ مریض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں میری صحت اچھی بھلی تھی، لیکن جب سے میں نے آپریشن کر دیا ہے، سارا نظام جسم ہی درہم برہم ہو گیا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ڈاکٹروں کی نیسروں اور ادویات پر خرچ کرتے کرتے تلاش ہو گئے ہیں اور اب کوئی متبادل طریقہ علاج سوچنے پر بھروسیا ہے۔

کچھ لوگوں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ایڈیٹھی مرض کو دوڑنہیں کرتی، بلکہ دیا دیتی ہے اور یہ دیا ہو ا مواد حملک تر صورت میں پھر سے اُچھتا ہے۔

جناب کلم صاحب، میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ جو ہو میڈیٹھی کو درپیش ہے، یہ ہے کہ لوہا گرم ہے، چوت لگائی۔

- اس وقت بانحن کے گن گانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بانحن کے لیے خاص نہیں شائع کرنا، اس کا فلسفہ بیان کرنا، بے معنی ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ شہر کے سرکردہ ہومیوپیٹھیس ہر چند ماہ کے بعد ایک پریس کانفرنس بلاینیں جس میں اخبار نویسیوں کے علاوہ ادیب بھی موجود ہوں، دانشور بھی ہوں۔ اس پریس کانفرنس میں آپ وہ نکال پیش کریں جن سے ثابت ہو کہ حیثیت طریقِ علاج ہومیوپیٹھی کو ایلوپیٹھی پر فضیلت حاصل ہے مثلاً:
- ۱۔ ہومیوپیٹھی ادویات کے معاملے میں ایلوپیٹھی کے مقابلے میں زیادہ "رج" ہے۔ اور ہومیوپیٹھی کے پاس بہت زیادہ تعداد میں دوائیاں موجود ہیں۔
 - ۲۔ ہومیوپیٹھیک ادویات کا ری ایکشن نہیں ہوتا۔
 - ۳۔ ہومیوپیٹھی کی ہر خواک انجمن کی حیثیت رکھتی ہے لیونکہ وہ مدد میں نہیں جاتی بلکہ مُنخ سے سیدھی خون میں شامل ہو جاتی ہے۔
 - ۴۔ ہومیوپیٹھیک ادویات بسا اوقات مرض کو اپریشن سے نجات دلاتی ہیں۔
 - ۵۔ ہومیوپیٹھیک دوائیاں صرف شفا ہی نہیں کھشیں، وہ امراض سے تحفظ بھی دلاتی ہیں۔
 - ۶۔ ہومیوپیٹھیک دوائیاں مقابلہ بہت سستی ہوتی ہیں۔ پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے ہومیوپیٹھی زیادہ موزوں علاج ہے۔
 - ۷۔ ہومیوپیٹھی میں ایسی دوائیاں موجود ہیں جو شراب اور تباکو جیسی بُری عادت پھرا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ زیادہ چائے پینے، شراب لہشی اور تباکو لہشی کے بُرے اثرات کو زائل کر سکتی ہیں۔
 - ۸۔ ہومیوپیٹھی میں ایسی ادویات موجود ہیں جو علم، فکر، دہم، عشق اور خوف کی شدت کو کم کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔
 - ۹۔ ہومیوپیٹھی مُرزاں بیماریوں کیلئے تیرہ بہت کام کرتی ہے۔ چلہے بیماری سالہا سال پڑانی ہو۔

جانب کلیم صاحب، آپ اور ہومیو پیچھے ڈاکٹر میری نسبت ہومیو پیچھی کی فضیلت کے نکات سے زیادہ واقعیت رکھتے ہیں۔

لازم ہے کہ اس پر لیں کافرنس میں خصوصی کیس پیش کیے جائیں، ان پڑھنے کے بعد مرنگوں کو پیش کیا جائے جو نے ہومیو پیچھے علاج کے باعث حملک امراض سے بچات پائی ہے، ان کی معنقدہ کیس ہسٹریاں ٹیسٹوں کی روپورٹوں کے ساتھ پیش کی جائیں۔

مقصد یہ ہے کہ صحافیوں اور دانشوروں کو یقین دلایا جاسکے کہ ہومیو پیچھے طریقہ علاج یعنی طور پر اپلی ہومیو پیچھی پر فضیلت رکھتا ہے۔ اگر ہم چند ایک اخبار نویسوں، ادیبوں اور دانشوروں کو یقین ملاتے ہیں کہ میاپ ہو جائیں اور پر لیں میں ایسے کیسرز کی اشاعت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہومیو پیچھی کی طرف لوگوں کا عام رجحان نہ ہو جائے۔ یہ ایک بہت بڑی خبریت ہوگی۔

آپ کے پچے میں میں نے چند ایک مضمایں چھوائے ہیں۔ ان مضمایں کا مقصد صرف یہ تھا کہ عام قاری کو ہومیو پیچھی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ لیکن آپ کے پچے کے عالمانہ درحققتاز مضمایں میں میرا مضمون ایسے لگتا تھا جیسے موردوں میں ایک کوتا آبیٹھا ہو۔ یا جیسے شدھ راگ میں ایک برجستہ سر لگادیا گیا ہو۔ چند لوگوں نے ان مضمایں پر تیرت کا اظہار کیا۔ گمان غالب ہے کہ ہومیو ڈاکٹروں نے جتنے لبیکرے مضمایں کاملاً اڑایا ہو گکا۔

کلیم صاحب ایں ہومیو پیچھی کا ایک پروانہ ہوں اور میری زندگی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگ ہومیو پیچھی کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے مستفید ہوں۔ میرا اداہ ہومیو پیچھے ڈاکٹر بننے کا نہیں ہے۔ چونکہ مجھ میں اس کی الیت نہیں، اس یہے میرا مقصد ڈاکٹری مفاد نہیں ہے۔ آپ کو ایسے لوگوں کی اشہد ضرورت ہے جن میں یہ جذبہ ہو کہ لوگوں کی توجہ ہومیو پیچھی کی طرف مبذول کریں۔ اس میں ہومیو پیچھی کا پھلاندیں، نہیں ہومیو ڈاکٹروں کا بھلا کے بلکہ اس میں، ان لوگوں کا بھلا کے جو انجانے میں فیشنی طریقہ علاج کی وجہ سے اپنی صحت کو تباہ کیے جا رہے ہیں۔

ناقابل قراموش

میں مجرمات کو مانتا ہوں لیکن ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں کشفت کو اہمیت نہیں دیتا۔

ما فوق الغطرت و احتیات میرے لیے باعث ہیت ضروریں لیکن میں انھیں ما فوق الغطرت نہیں سمجھتا۔ اگر آپ سچے دل سے مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے تو پھر ما فوق الغطرت کے معنی ہے اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی عقل محدود ہے اور حیات کا دائرہ کام محدود ہے تو پھر ہیت واقعہ پر نہیں بلکہ اللہ کی عظمت پر ہوتی ہے۔

سانس جان بوجھ کر ما فوق الغطرت سے مُخْرِج مورے بیٹھی ہے۔ بیجا ری کیا کرے تسلیم کرے تو مشکل، رد کرے تو مشکل۔ اور ما فوق الغطرت و احتیات روئے زمین پر اکڑو بیشتر ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ما فوق الغطرت واقعہ اللہ کی طرف سے ایک بنیام ہے۔ ایک یادداہی "تمہارا رُخ ٹھیک نہیں۔ اسے ٹھیک کرو۔ اب بھی سمجھ جاؤ۔ دیکھو۔ خور سے دیکھو۔ سب کچھ سامنے پڑا ہے۔ عیاں سے۔ کوئی پرده حائل نہیں۔۔۔ دیکھ لو۔"

بھروسہ، میری دلست میں سب سے بڑا ممحونہ صرف ایک ہے جو مجھ پر رونما ہوا۔ گمان غالب ہے کہ آپ اسے اہمیت نہیں دیں گے۔ لیکن گے کری تو ایک عام سی بات ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ اہم ترین دلتعہ ہے جو کسی انسان پر دفعہ پذیر ہو سکتے ہے۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔

سکول میں میں ایک نالائی طالب تھا۔ رعایتی پاس ہو جاتا، کیوں کہ ہمیڈ ماسٹر کا بیٹا

تھا۔ کالج میں دل نہ لگا کیوں کہ شدید احساسِ مکر تری کا شکار تھا۔ بی اے میں عشق کا آزار لگا بیٹھا۔ پھر یہ بُلبلہ چھوٹا۔ ایک تکلیف دہ خلایپڑا ہو گیا۔ اتفاق اس منے کتاب آگئی۔ مطالعے میں ڈوب گیا۔ اس زمانے میں برڑنڈ رسل، دلیز، بالدین، ہکسلے پیش پیش تھے۔ انہوں نے مجھے سانسی اور سیکولر رُخ عطا کر دیا۔ پھر ہمیں مذہب سے کوڑا تھا میں زید سپاٹ ہو گیا۔ پھر فلسفہ سے نسیات میں جا گھا نسیاں ہیں جس اور سائیک سانس یعنی ای ایس پی میں جا پہنچا۔ محض یہ کہ ان دنوں میں ایک معقول پڑھا لکھا بے مذہب سیکھ رہا جسے روحانیت کا شور نہ تھا۔

ان دنوں میں راولپنڈی میں وزارتِ اطلاعات کے ایک ذیلی دفتر میں کام کرتا تھا۔

پہلے بڑا صاحب مجھ پر بڑا ہمراں تھا۔ پھر دفعتاً بظاہر بے وجہ میرے خلاف ہو گیا۔ اس نے مجھ پر دو لکیسر کر دیے۔ ایک عام سا اور دوسرا سنتین نزعیت کا تھا۔ میں طبعاً ڈرپوک اور نردوں آدمی ہوں۔ بار بار کی جواب طلبیوں اور رانکو اڑی یکمیٹیوں سے سخت گھیرا گیا۔

ایک دن علوٰؑ اربابِ ذوق راولپنڈی کے سیکریٹری عزیز ملک، جو ایک جانپھانے صاحبِ طرز ادیب ہیں، مجھ سے کہنے لگے ”مفتقی صاحب، معلوم ہوتا ہے آپ پریشان ہیں۔ کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”ہاں ہوں“ اور میں نے اسے سارا قصہ سُنا دیا۔

ملک بولا۔ اگر آپ کہیں تو ہم کسی بُزرگ سے درخواست کروں آپ کے لیے دعا کریں۔“
میں نے کہا ”ضرور کیجیے“

کہنے کر تو میں نے کہ دیا لیکن ان دنوں نہ میں بُزرگ کے مفہوم سے واقع تھا، نہ دعا کی طاقت کا شور رکھتا تھا۔ عزیز ملک کہیں ادیب کی چیزیت سے جانا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ صاحبِ روحانیت بھی ہے اور ایک بُزرگ کی خدمت میں پچیس سال سے باقاعدہ حاضری دیتا رہا ہے۔

چند ایک روز کے بعد ملک مجھ سے ملا۔ کہنے لگا ”میں نے ان بُزرگ سے آپ کا

تذکرہ کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا: ہم تو اس لائی نہیں کہ دعا کے لیے لاٹھ اٹھائیں۔ بہتری ہے کہ آپ منی صاحب کو سرکار قبلہ کی خدمت میں لے جائیں اور ان سے کہیں کہ وہ خود ان کی خدمت میں دعا کے لیے گمراش کریں۔“

یہ سب باتیں میرے لیے ہے متنی تھیں۔ میں ان کے منزوم سے واقعہ رکھتا۔ لیکن عزیز ملک کے جذبہ ہمدردی اور حُسینِ اخلاق کی وجہ سے میں نہ اس کے ساتھ جانا قبول کر لیا۔ ملک نے کہا "جسے کے روز میں آپ کو سرکار قبلہ کی خدمت میں لے جاؤں گا۔" جسے کے روز عزیز ملک آگیا اور ہم دونوں پل پڑے۔ چلتے چلتے ہم مریڑ کے قبرستان میں جا پہنچے۔ مریڑ راولپنڈی صدر کا ایک مضامن ہے جوہ میرے لائیں پر واقع ہے۔ قبرستان میں ایک چوگان ساتھا جس کے گرد تاریخی ہوتی تھی۔ چوگان کے اندر کچھ پیڑ رکھتے۔ ایک لمبا جوڑا پختہ تھرا اس بنا ہوا تھا۔ اس کے ملتحم ایک چار دیواری تھی۔ اس چار دیواری میں ایک جا تب کھڑکی نہاد روانہ تھا۔

جب ملک اس کھڑکی نہاد روانے سے میں داخل ہوں تو میں گھبرا گیا۔ میں سمجھا تھا کہ سرکار قبلہ کسی فرد کا نام ہو گا جس کے حضور مجھے لے جایا جا رہا ہے۔ کسی مزار یا قبر پر جانا میرے لیے ناقابل قبول بات تھی۔ کسی بُزرگ سے دُعا کرنے میں بھروسی کوئی بات تھی لیکن قبر سے مخاطب ہونا، کسی مرحوم و مبغور کو دعا کے لیے کہنا، میرے بیٹھنی طور پر مضمون خیز تھا۔ اس وقت الگ مجھ میں اخلاقی جرأت ہوتی تو میں ملک سے کہتا "عزیز ملک، تم تو پڑھ لکھے کوئی ہو۔ ایک صاحب طرز ادیب ہو۔ صاحبِ عقل و دانش ہو۔ ذہنی طور پر حقیقت پسند ہو۔ پھر یہ کیا حقیقت ہے؟ تم تو مجھے کہاں لے آئے ہو؟ اب میں اس میقی کے ڈھیر سے کیا کھوں؟ کیسے درخواست کروں کہ دُعا کرو۔ یا رہ، میرا مذاق ترہن اڑاؤ۔" لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی۔ اس لیے میں بُرے سے دل سے چُپ چاپ ملک کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ اندر لیکن ٹالکوں کا فرش بچھا تھا اور ایک طرف سفید ٹالکوں کا مرقد بنا ہوا تھا۔ مرقد کے پتھر پر لکھا تھا "حضرت سائیں اللہ علیہ السلام نقشبندی

قندیلی" نہ مجھے نقشبندی کے مفہوم کا علم تھا، نہ قلندری کا پتا تھا۔ ساری باتیں ہی صلح تھیں۔
ملک نے کہا "مفہی صاحب، آپ کو کوئی آیت یاد ہے؟"
میں نے کہا " بلا۔ صرف الحمد۔"

"بلا" تھیک ہے۔ الحمد شریف پڑھیے۔ پھر درود شریف پڑھیے۔ اور پھر نیایت خشورع
سے اپنی درخواست پیش کر دیجیے۔"

"خشورع۔" مجھے سنسی آگئی "نہ یقین، نہ ایمان۔ خشورع کمال سے آئے گا۔"
بھر جال، میں نے دوستوں کے لامبا اٹھائے، زبان نے روکھے انداز سے الحمد پڑھی اور پھر میں
نے اپنی گزارش کر دی۔ دہ گزارش گزارش نہ بخی، منست نہ بخی، الجائز بخی۔ جب سامنے قابلِ احرازم
ہستی کے وجود کا احساس ہی نہ ہو تو منست کیسی، المجاز کیسی۔ اس سارے عمل میں نہ ذہن شامل ہوا
نہ دل۔ زبان نے بھی محض رسم ادا کی۔

چار دلیواری سے باہر نکل کر میں نے سچے دل سے زیرِ لب کہا "شکر ہے۔ جان چھوٹی ہے۔"
ملک صدر میں رہتا تھا۔ میں شریں۔ ہمارے راستے الگ الگ تھے۔ اس یہے ملک
نے مجھے خدا حافظ کہا اور رخصت ہو گیا۔
پھر سات دن گزر گئے۔

اس دوران میں میں اس مزار اور دعا کے لطیفے پر دل کھول کر ہنس لیا اور پھر اس دافتھے
کو بھول گیا۔ ایک روز ملک پھر آگیا۔ کچھ مضراب ساتھا۔ بلا۔ مفہی صاحب! ہم سے ایک غلطی
سرزاد ہو گئی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"بلا" میں بھائی جان سے طاہر ہو،

"یہ بھائی جان کون ہیں؟"

"وہ سائیں اللہ بخش کے بالکے ہیں۔"

”آپ انھیں بھائی جان کیوں کہتے ہیں؟“
 ملک بولا ”نقشبندی اپنے مرشد کو بھائی جان کہ کر ملاتے ہیں۔“
 ”نقشبندی کون ہیں؟“

ملک ہنسا۔ بولا ”آپ کو سب علم ہو جائے گا۔ چوں کہ بھائی جان نے بتایا ہے کہ مفتی
 ہمارا بھائی ہے، ظاہر ہے کہ آپ بہت جلد ہم میں شامل ہو جائیں گے۔“
 اس خوش فہمی پر میں بہت محفوظ ہوا۔

ملک بولا ”مفتی جی، ہم سے غلطی ہو گئی کہ ہم نے سرکار قبلہ کی خدمت میں مجھے کے روز
 حاضری دی۔ بھائی جان فرماتے ہیں کہ مجھے کے روز صاحبِ مزار اپنے مقام پر موجود نہیں ہوتے؛“
 یہ سن کر میرا جی چاہا کہ تھقہ مار کر ہنس دوں۔ مجھے ملک کی عقل سلیم پر شکوک پیدا ہونے
 لگے۔ میں نے حیرت سے ملک کی طرف دیکھا۔ یہ لکیساً ادمی ہے! بظاہر اس قدر معمول یکن باطن
 میں اس قدر محبوں!“

ملک بولا ”بھائی جان فرماتے ہیں، ایک مرتبہ پھر سرکار قبلہ کی خدمت میں حاضری دو
 لیکن مجھے کا روز نہ ہو۔“

”ماں گاڑا! یہ میں کس مصیبت میں چھپا گیا۔“

بھی چاہتا تھا کہ ملک سے صاف صاف کر دوں ”جناب والا، مجھے اور نہ بناو۔ بہت
 ہویا۔ اب جان بخشنہ۔“ مگر ملک کے ٹوپیدالیسی بات کرنا ممکن نہیں۔ اس کی شخصیت اتنی پر وقار
 ہے، اس کے اندازیں اس قدر خلُوص ہے کہ آپ عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔
 میں نے بھی مجبوراً اس تسلیم خر کر دیا۔

اس کے باوجود دمیرے اندر بختی ناج رہے تھے۔ ”صاحبِ مزار اپنے مقام پر حاضر نہیں
 ہوتا۔ ہمنہ! مجھے کے دن چھپی کرتا ہے۔ درخاستیں موصول نہیں کرتا۔ بلا بلا بلا۔“ ہا! منیٰ کے
 تو دے تئے دبا ہوا سرکار قبلہ!“

اندر ایک ہنگامہ رجھا ہوا تھا۔ برٹین ڈرسل مسکرا رہا تھا۔ طنز۔ بھری سکراست۔ کبستے
سر پھیٹ رہا تھا۔ دلیز طعنے دے رہا تھا۔ فراسید سر تھا میں بیٹھا تھا۔ ماں کس تلوار لہرا رہا تھا۔
چند روز کے بعد ملک بچھر میرے دفتر آگئی۔ بولاً ”اگر آپ کو فرصت ہو تو چلیے سر کا۔ قبضہ
کی خدمت میں حاضری دے آئیں“

ہم دنوں چل پڑے۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے قربانی کا بکرا تھا۔ طبیعت غم و خفہ سے
بھری ہوئی تھی۔ اس روز مجھے سائیں اللہ بخش کامزار یوں لگ رہا تھا جیسے کسی ملاری کا ڈیپا ہو۔
میں نے تمثیل آمیز انداز میں الحمد پڑھی، غیر دعا ایسا انداز میں دعا کی، یوں جیسے کوئی کسی کامل انداز
اٹھاتا ہے۔

باہر نکل کر میں نے سچے دل سے لا ہوں پڑھی۔ چل جان چھٹی۔ ملک اس کا رخیر کی تکمیل پر
بہت خوش تھا۔ اور میں اسے ذہنی مریض سمجھ رہا تھا۔ خیر، ملک نے مجھے خدا حافظ کہا اور
رُخْصت ہو گیا۔

وہاں سے میرا گھر تقریباً ایک میل دور تھا۔ آدھامیل کھیتوں سے گزرنا پڑتا۔ اس کے بعد
اکھمیل آبادی سے۔ ابھی میں مزار سے مخوتی ہی دودر گیا تھا کہ میرے اندر گوایا ایک ہوانی سی چلی۔ ایسے
لگا جیسے اندر زدن سے سرڈا و اونٹ کی بتریں کھل گئی ہو۔ گلبدوں کا ایک طوفان اٹھا اور بچر ان جانے
میں میں کچھ سیشی کے گلاس کی طرح تڑپخ گیا۔ اور بچر پھوٹ پھوٹ کر بھیں بھیں کہہ رہے رہنے لگا۔
پتا نہیں میں وہاں کتنی دیر کھڑا رہتا رہا۔ جب کچھ ہوش آیا تو میں نے چاروں طرف
نظر دڑائی۔ کسی نے دیکھا تو نہیں، شکر ہے قرب دوار میں کوئی نہ تھا۔ بچر میں حیرت میں
ڈوب گیا۔ یہ کیا ہوا؟ مانی گاڑ! ان دنوں اللہ سے متعارف نہ تھا، اس لیے مانی گاڑ، مانی گاڑ
چلتا رہا۔ اس زمانے میں نہ تو میں بزرگوں کی طاقت سے دافت تھا، نر قوت کی یقینت سے
آشنا۔ نہ ہی مجھے علم تھا کہ بزرگ جادوگر ہوتے ہیں، طبیعت میں جلال بھی ہوتا ہے، احسانِ مزار
بھی اور تماشا دریکھنے کا شوق بھی۔ اس لیے یہ دا تو میرے لیے ہی ریان گُن تھا۔ میں سمجھتا تھا اس

یکفیت کا صاحبِ مزار سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو کوئی ذہنی عارضہ ہے۔

اس زمانے میں ادب میں داستوں کی میرا بہر تھا۔ اس کی تحریریں میرے بندبند میں رچی ہوئی تھیں۔ مجھے علم عقا کردہ نارمل نہ تھا۔ اس پر مرگی کے درے پڑتے تھے۔ میں بھاشاید میں بھی داستوں کی نقش قدم پر چل نکلا ہوں۔ کچھ دیر تو میں نے آنسو پرچھے، منحصات کیا، پھر خود کو سنبھالا اور اس گے چل پڑا۔ سوچ جاس قدم چلا تھا کہ پھر وہی ہوا ہی چل۔ ڈز سے سوڈے کی بوتل کھلی، بُبلوں کا ایک طوفان اُپر کی طرف اُبھرا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ شدید کوشش کی لیکن اس وقت گویا میں میں نہ تھا۔ میری میں دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک سوچنے والا میں، ایک محسوس کرنے والا میں۔ محسوس کرنے والے میں سے چھینٹے اڑا رہے تھے، بھاگ اُٹھ رہا تھا۔ بندبند بھن بھن کر رہا تھا۔ جیسے بھرطوں کا چھتا ہو۔ سوچنے والے میں کے ہاتھ سے کسر دل نیکل چکا تھا۔ وہ بے بس لاچار کھڑا تھا۔ مائی گاڑا! مائی گاڑا! — یہ کیا ہو رہا ہے!

اس آدھیل کے ناصیلے کے دران مجبوب تین درے پڑتے۔ اس کے بعد سوچنے والا میں بالکل فیروز ہو کر رہ گیا۔ عمر اور بے بھی سے چور، خفت اور حیرت سے اُدھوڑا۔ پھر آبادی کا علامہ آگیا۔ مجبوب مزید خوف طاری ہو گیا۔ لوگ کیا کیمیں گے؟ وہ مجھے پاگل خانے سے چھٹا ہوا سمجھیں گے۔ اگر کسی واقعہ کا نہ دیکھ لیا تو؛ مجھے مائی گاڑا کہنا بھی بھول گیا۔ آبادی میں پہنچ کر میں نے مفلر سے منجھ پسیٹ لیا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ پھر مجھے پتا نہیں کیا ہوا۔ ایک جگہ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے، دوسری جگہ بھوپانکھیاں اُکھار رہے تھے، کچھ تمسخر سے ہنس رہے تھے۔ دو ایک دھنڈے سے آوازے سنائی دیے: پاگل ای اوسے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے خود کو اچھی طرح سنبھالا۔ منجھ پرچھا۔ آنکھیں صاف کیں پھرے پر سمجھیدگی سجائی اور اندر داخل ہو گیا۔ میں سخت خوف نزدہ تھا۔ اگر گھر میں دورہ پڑ گیا تو؛ میں درے سے نہیں، اپنی بیوی سے ڈرتا تھا۔

میری بیوی امین آباد کے شیخوں میں سے ہے۔ وہ سب نو مسلم ہیں۔ انہیں بُت پرستی کسی صورت میں گواہا نہیں۔ لہذا وہ نہ پیر کو مانتے ہیں، نہ فقیر کو، نہ معجزہ ات کو، نہ کشف کر۔ وہ صرف اللہ کی ذات کو مانتے ہیں۔ قرآن کے احکامات کو مانتے ہیں اور ہیں۔ اگر ان کا بُس چلے تو پیغمبر کو بھی بندے سے زیادہ چیختیت دینے سے انکار کر دیں۔ کسی بُزرگ یا بابا کی بات کوں تو میری بیوی کے جرے پر تخریج بری مسکراہست پھیل جاتی ہے۔ اس مسکراہست کی دھار میں بہت کاٹ ہوتی ہے۔ میں اس کاٹ سے خالق ہوں۔

اس وقت تک میری زندگی میں کوئی بابا داخل نہ ہوا تھا۔ سوائے کوٹلا سنتر والے بابا کے۔ کوٹلا سنتر کے بابا کے ڈیسپے پر میں اتفاق سے جا پہنچا تھا۔ اس عمل میں نہ طلب کا دخل تھا، نہ یقین کا، نہ ایمان کا۔ ہوا یوں کہ ایک روز صدر بازار میں گھوستے پھرتے مجھے قیومِ مل گیا۔ قیوم میرا پُنا اور بے تکلفت دوست تھا۔ وہ ایک مُخھ پھٹ، جاذب اور شوخ شخصیت کا مالک تھا۔ اسے پُندھی میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

”ار سا بتم یہاں!“ میں چلایا۔

”کیوں؟ میرے پُندھی آنے پر بین لگی ہے کیا؟“

”مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟“

”کیسے دیتا“ وہ بولا ”والی محترم ساختہ ہیں۔ با ادب بالاحضر ہوشیار کا عالم ہے۔ یار دوست کی گنجائش نہیں۔“

”چلو کسی ریستوران میں بیٹھ کر باتیں کروں؟“

”اوہ نہیں۔ ریستوران نہیں۔ چل میں مجھے ایک ایسی جگہے چلتا ہوں جہاں فسٹ کلاس کرک چائے ملنے لگی اور ایسی زمینِ محفل کہ رنگ رہیں میں ڈوبے بیٹھے رہو گے۔“

وہ مجھے کوٹلا سنتر کے بابا کے جرے میں لے گیا۔

صدر بازار کے ایک کونتے میں وہ ایک لمبا سا کمرا تھا۔ دیواریں اور فرش منقش سے

پڑتے ہوئے تھے۔ فرش پر چٹانیاں بھی ہوئی تھیں۔ دلوں دلیاروں کے ساتھ ساتھ بہست سے لوگ قطار میں احترام کی وجہ سے گھٹریاں بننے لیتے تھے۔ ایک سمت ایک پہلوان نما آدمی جس کا سر اور جنونی منڈی ہوئی تھیں، سفید چادر پیٹھے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی تھالیوں میں دو منی کے دیے جل رہے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا جیسے میں کسی اور دنیا میں آداخل ٹھہرا ہوں۔ متنی کے دلیوں کی دھنلنی روشنی نے کمرے کو پر اسرار بنا رکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے الف لیلہ کا کوئی باب گھل گیا ہو۔

بابا کے منڈے ہوئے سراہد بھوٹوں کے گرد دو بڑے بڑے کان دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ جیک دی جائیٹ کھل ہو، اور اس کے گرد قطا روں میں مردوں کی لاشیں ڈھیر ہو رہی ہوں۔ قیوم نے داخل ہوتے ہی بڑے بے باکا نہ انداز میں اسلام علیکم کہا۔ گویا کسی نے ستم سم پھونک دیا۔ اس پر دلیاروں سے لگی ہوئی ڈھیریوں میں جان پڑ گئی۔ وہ سبکے سب اکھر کھڑے ہو رہے گئے، اور باری ہم سے باہت ملانے لگے۔ آخر میں بابا کی باری تھی۔ وہ جوں کا توں بیٹھا تھا۔ قوم ہجھکا۔ بابا سے مصافحہ کیا۔ بابا نے باہت بڑھا کر اس کی کمر کو تھیک کا اور بھر ہم ایک طرف کوئی نہیں بیٹھ گئے۔ "بسم اللہ بسم اللہ۔ حمآن آئے ہیں" بابا بڑھ رہا۔ اس پر بابا کا خدمت گاراٹھا۔ اس نے ایک بڑی کیتلی اٹھائی اور پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ چائے کروکھی۔ گرم تھی۔ بے خوشبو کے لذیذ تھی۔

قیوم اور میں انہیں کرنے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ "ابے یہ لائیز ڈن (DEN ۲۱۰۷) تو نے کیسے ڈھونڈا؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا۔ بولا "یہ امریکہ محترم والد صاحب کی دریافت ہے" ماخول کی وجہ سے ہم دہائی ذاتی گفتگو نہ کر سکے۔ ماخول کی پر اسراریت نارمل گفتگو کرنے میں مزاحم تھی۔ ادھر بابا جنکارے انداز میں باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں عالم نہ ہمیں تھیں۔

پتا نہیں مجھے عالمانہ باتوں سے کیوں چرڑھے۔ کوئی عالمانہ بات کرے تو مجھے یہے لگتے ہے جیسے خالی زبان کرتے دکھارہی ہو، اور بات کا دل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ معانی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد عالموں کی دل آذاری نہیں۔ لیکن کیا کہوں۔ میں ایک انجان آدمی ہوں۔ جانشنے سے دل پیپی نہیں لکھتا۔ مانا چاہتا ہوں۔ اور مانتے کا ذہن سے نہیں، دل سے تعلق ہوتا ہے۔
بابا بربڑی بڑھی باہمیں سیدھے سیدھے لفظوں میں بیان کر رہا تھا۔

میں نے قیوم سے کہا ”یار، یہ بابا کیا چیز ہے؟“

قیوم بولا ”تجھے کیا لگتا ہے؟“

میں نے کہا ”یار، مجھے تو جن لگتا ہے، جن ॥“

اس پر بابا محفل کو متوجہ کر کے بولا ”یہ آج پہلاً آدمی ڈبیر سے پہ آیا ہے جس نے ہیں پہچانا ہے۔ کتاب ہے بابا جن ہے۔“

سب کی نگاہیں ہماری طرف اٹھ گئیں۔

قیوم زیرِ لب بولا ”یار، بابا ہمت سنتا ہے۔ تو اور میں مل کر مجھی اتنا نہیں مُن سکتے جتنا یہ سُنتا ہے۔“

”تجھے پتا ہے“ بابا نے منہ موڑ کر کہا ”بُونا الذت ہے۔ سُننا انسان کو دیکھی بناتا ہے۔“ ارسے ! یہ تو بڑا حاضرِ حِداب بابا ہے ”میں نے سوچا۔ پھر میں نے محفل میں چل جہڑاں چلانی شروع کر دیں۔ وہاں لوگ احترام کے مارے منځ سے بات نہیں کرتے تھے۔ مجھے چل جہڑاں چلاتے دیکھ کر سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اس پر بابا بولا ”مجھ، کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہماری محفل میں ایک جیلیبیاں تلنے والا آگیا۔“

اس کے بعد میں اور بابا درست بن گئے۔ اور بابا اللہ لے کر میرے پیچھے پڑا گیا کہ مدد حاضری دوں۔ میری حاضری کو نہ اسلام سے تعلق تھا، نہ ایمان سے، نہ روحاںت سے۔ وہ تو ایک لذتِ کلام تھی جس کی وجہ سے لوگ حیرت سے میری طرف دیکھتے اور بابا تھیں بھری نظرِ ڈالتا۔

اس لذت کے لیے میں دہلی روز جانے لگا۔ چائے عام نہی تھی۔ مفت اور بار بار۔ جیتنے کے جیتنے گیا۔ میری
کے دن بابا گیارہ دیگیں پکانا اور ہمیں بڑے پیارا درود توجہ سے کھلاتا۔

ہل تو اس وقت تک میری زندگی میں کوئی بابا داخل نہ ہوا تھا، سو اسے کوئی نلا ستر کے
بابا کے۔ اور اس سے بھی میں بابا کی حیثیت سے نہیں ملتا تھا۔ الٹا میں نے اُسے مند سے اُتار کرنا پڑے
پاس نہیں پہنچایا تھا۔

میری بیوی میرے بابا کے ہاں جانے پر میرامداں اٹھایا کرتی تھی۔ میں نے اسے لاکھ بار
سمجنے کی کوشش کی کہ نیک بخوبی میں بابا کے پاس نہیں جاتا، کوئی منت نہیں مانگتا، کوئی
مشکل نہیں پوچھتا۔ نہ طلب ہے نہ مانگ۔ میں تو ایک دوست کے ہاں جاتا ہوں اور وہ بڑا
اچھا دوست ہے۔ لیکن میری بیوی میری بات نہ سمجھی اور میرامداں اٹھاتی رہی۔

ہل تو اس روز جب میں گھر میں داخل ہوا تو مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اگر گھر میں دورہ
پڑ گیا اور میں بھیں بھیں کر کے رو پڑا تو میری بیوی کیا کہے گی۔

اس مصیبت سے خود کو محظوظ کرنے کے لیے میں سیدھا اپنے بستر میں جا گھس اور تنہ پر
رضائی لے لی تاکہ بیوی کی نگاہوں سے محظوظ رہوں۔

بیوی بھی ”آتے ہی بستر میں پڑ گئے۔ خیرتی تو ہے؟“

میں نے کہا ”کچھ طبیعت خراب ہے۔ نیندا کجلے تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔“
وہ باہر چل گئی اور بادرپی خانے میں کام کرنے لگی۔ چلو جان چھٹی، میں نے کہا۔ اور چچکے
سے لیٹ گیا۔ پھر خیالات آنے لگے۔ میں ڈر گیا۔ اگر دھیان اسی واقعے پر کوئی زور رکھتا تو پھر ہنسے
سوڑے کی بولن کھل جائے گی۔ اس لیے میں نے جان بوجھ کر خیالات کا رُخ موڑا۔ ہاں تو، اب نیا
انسان لکھوں۔ مرکزی خیال کیا ہو؟

پھر دفعتہ ایک چار دلواری دوڑتی ہوئی آئی اور میری رضائی میں گھس گئی، اور دیکھتے ہی
دیکھتے میرے چاروں طرف گھیرا کر کے کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک مرقد اُبھرا۔ مرقد پر ایک بڑھا آدمی

سر پر دُمی ٹوپی رنگ نے بیٹھا حق پی رہا تھا۔ بھروسہ تصویر مترسک ہرگئی، گیارہ تاری میں فلم چلنے لگی۔ مرقد کی تنقیت قریب آگئی۔ اور قریب۔ اور قریب۔ ساری رضاں سائیں اللہ بخش سے مجھگئی۔ دفعہ ہوانی اُجھری۔ آئی، آئی۔ میں نے سوچا۔ کہیں آواز پیدا نہ ہو۔ بیوی نہ سُن لے۔ میں نے رضاہی منخ میں ٹھوٹنے لی۔ نعم۔ اون۔ سوڈے کی بوتل تھل گئی۔

پھر جو بھے ہو شہ آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیوی سر رانے کھڑا آپ ہی آپ بڑا بڑا رہی ہے۔ ”یہ رونے کی اُواز کہاں سے آئی تھی؟“ میں نے بھٹ خاتے لینے شروع کر دیے۔ وہ حیرت سے بڑا بڑا ہوئی اُالپس پادری خانے میں چل گئی۔ ”یہ کون رہ رہا تھا؟ عجیب رونا تھا!“ اگلے روز جب میں چائے پی رہا تھا تو وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئی۔ بولی ”ایک بات پوچھوں؟“

”میں نے کہا“ پوچھ۔

بولی ”آپ نے بابا بدل لیا ہے کیا؟“
”میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔“ بابا بدل لیا ہے!“ میں نے مصنوعی حیرت سے دھرا یا۔

بولی ”رات مجھے خواب میں اشارہ ہوا ہے!“

یہ بھی ایک حیران گن بات ہے۔ میری بیوی روحانی دُنیا کو بالکل نہیں مانتی۔ اس کے باوجود اسے اشامے ہوتے رہتے ہیں۔ میری بیوی کو عام طور سے ادھ سوتے ادھ جاگتے میں اشارے ہوتے ہیں۔ اور حیرت کی بات ہے کہ وہ ہمیشہ سچے ثابت ہوتے ہیں۔ جب بھی گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ رومنا ہونے والا ہوتا ہے تو وہ پہلے ہی سے اس کی خبر دے دیتی ہے۔

اس لوز جب اس نے مجھ سے بابا بدلنے کی بات کی تو میں حیران رہ گیا۔ بہ حال، اس نے مصنوعی حیرت سے پوچھا ”تجھے کیا اشارہ ہوا ہے؟“

بولی ”آج صبح جب میں ادھ جاگی پڑا یعنی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سہر پوش بزرگ

اندر آئے۔ بُرے: تیر سے میاں نے جو یہ بابا اپنایا ہے، بالکل صحیح ہے۔ اس سے پہلے والا غلط تھا ॥

میں کھسیانی ہنسی ہنسا۔ میں نے کہا "یہ محارادھم ہے" ۔
بُولی "نہیں، دھم نہیں۔ انھوں نے مجھے نیا با باد کھایا بھی تھا۔ اس نے سر پر ٹوٹی
ٹوپی پہنی ہوئی تھتی اور دہ حضرت پی رملہ تھا" ॥

دفعہ میرے سامنے وہ چار دلواری ابھری۔ سفید ٹاللوں کے مرقد پر روحی ٹوپی پہنے
با با حضرت پی رملہ تھا۔ پھر وہ چار دلواری گھومنے لگی۔ میرے اندر ہواں سی چلی۔ میں چھلانگ مار کر
اٹھا اور باخت روم کی طرف بھاگا۔ یہ دیکھ کر میری بیوی ہٹکا بکارہ لگئی۔
وہ باخت روم کے دروانے پر آکھڑی ہوئی۔ بُولی "خیرتیت تو ہے؟" میں نے اس
وقت مُنھ میں اپنی قیص کا دامن ٹوپش رکھا تھا کہ جھیں جھیں کی آذان نہ نکلے۔ پھر دیر وہ
دروانہ کھلکھلتی رہی۔ پھر حلی گئی۔

جب رقت کے دورے سے فارغ ہوا تو سپلی مرتبہ میرے مُنھ سے اللہ کے حضور
التحان نکلی "یا اللہ! یہ کیا ہو رہے ہے؟"

پہلی مرتبہ میں نے اللہ کرپکارا۔ خدا کو نہیں، مائی گاڈ کو نہیں، اللہ کو پکارا۔
آخر دس روز مجھ پر سی کیھنیت طاری رہی۔ گھروں والوں کو پتا چل گیا۔ دفتر والوں کو
علم ہو گیا۔ وہ حیران تھے کہ مفتی کو کیا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ بڑے صاحب نے مجھے زج
کر دیا ہے اور میں ٹوٹ چکا ہوں۔

یہ خبر بڑے صاحب تک پہنچی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ غالباً وہ یہی چاہتے تھے
کہ میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں، اور ان کے قدموں میں بچھ جاؤں۔ میری اناکو یہ گوارہ نہ تھا۔
پھر ہیں ملک کی طرف بھاگا۔ لیکن ملک سے صاف بات کہ دنیا مجھے گوارہ نہ ہوا۔
ایک پڑھے لکھے، سمجھدار اور معقول آدمی کے لیے یہ تسلیم کرنا کتنا مشکل ہے کہ ایک محروم مُنفوذ

بابا نے اسے یوں چھڈ کر رکھ دیا ہے، جیسے ملک شیکر کی مشین دو دھو کو چھڈ کر رکھ دیتی ہے۔ میں نے کہا ”ملک، یہ جو سائیں اللہ بخش ہیں، جن کے مزار پر تم مجھے سے گئے تھے۔ یہ کون بزرگ ہیں؟“

ملک سکرایا اور پھر ملک شیلف سے ایک کتاب اٹھا کر سے آیا۔ کتاب کا نام تھا، ”مرد قلندر“۔ ملک نے کتاب میرے ہاتھ میں ہٹا کر کہا ”یہ پڑھ لیجیے۔ آپ کو سب پتا چل جائے گا۔“

کتاب کے سروق پر لکھا تھا ”عزیز ملک یہ کتاب تم نے لکھی ہے کیا؟“ میں نے ملک سے پوچھا۔

ملک نے اثبات میں سرہلا دیا۔ کتاب پڑھنے کے بعد پتا چلا کہ سائیں اللہ بخش کو روحا نیت درستے میں ملی تھی۔ آبائی پیشہ تھام کا تھا: بچپن میں پہلوانی کا شوق تھا۔ نوجوانی میں ہی عشقِ الہی میں والہانہ طور پر بخوبی گئے۔ خود کا ہوش نہ رہا۔ طبیعت میں قلندر ان رنگ غائب تھا۔ ”مرد قلندر“ پہلا نذر کرے تھا جو یہی نظر سے گزرا۔ اس میں بہتر سی باتیں میرے یہے جیران کُن اور ناقابل قبول تھیں۔ اگر ان دونوں میں اس پریشان کیفیت میں نہ ہوتا جس میں کہ میں تھا تو مرد قلندر کے چند ایک صفات دیکھ کر لا حول پڑھ کر اسے پھینک دیتا۔ لیکن میں تو خود جیران کُن مشاہدات کے درمیان جی رہا تھا۔

مرد قلندر کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی کچھ بھیدن نہ کھلا۔ اُس اور بھی پُرسا رہ گیا۔ پھر اتفاقاً یوسف ظفر کے گھر بھائی جان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کا نام خواجہ جان محمد تھا۔ بھائی جان کو دیکھ کر بات اور بھی الجھ گئی۔

میرا خیال تھا کہ بھائی جان بیاں کی چیز ہوں گے۔ مرد قلندر کا رنگ غالباً ہو گا لیکن یہے رُو برو ایک خوش شکل، دراز قامت، چاق و چوبند، معززہ اور معقول شخص لھڑا تھا۔ ان کی گفتگو مسائل حاضرہ پر مرکوز تھی۔ نقطہ نظر حقیقت پسندانہ تھا۔ ان کا روایت نہایت مخلصاً نہ تھا اور ان کے

برتاڈ سے اخلاص و محبت چلک رہا تھا۔

بھائی جان کی شخصیت میں مذہبی عصر مفقود تھا۔ ان کی گفتگو میں روحاںی رنگ نہ تھا۔ لیکن ان کے پاس ایک کردار تھا اور اس کردار میں اسلامی اصول رچے بیسے تھے۔ وہ غلو اور لاف زنی سے پہاڑیز کرتے تھے۔ منہ زبانی دعوے کرنے کے حق میں نہ تھے۔ جو کہتے تھے اسے عملی طور پر کر دکھاتے تھے۔ عالمانہ بحث کرنے سے گیر کرتے تھے۔ پند و نصیحت کرنے کے حق میں نہ تھے۔ بھائی جان کے کردار سے میں بے خدمت اٹھا۔ یہ کیسا بزرگ ہے جو زبان سے پکھنیں کتا، عمل سے متاثر کرتا ہے!

میں نے تخلیے میں بھائی جان سے شکایت کی۔ میں نے کہا "جناب، میں نے تو سرکار قبل کو ایک دنیادی مشکل میں مدد کرنے کے لیے پُکارا تھا۔ انہوں نے یہ کیا ظلم کیا کہ رقت طاری کر کے میری شخصیت کو ہی مسخ کر دیا"

میری شکایت سن کرو و دفعہ سنبھیدہ ہو گئے۔ بولے "میں تو ان کا ایک ادنی اعلام ہوں۔ وہ مالک ہیں۔ جو چلتے ہیں کرتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتے والا کون ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ معاملہ سرکار قبلہ اور آپ کے درمیان ہے۔ آپ خدا از سر نہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی گزارش پیش کریں۔ مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ حضور نے فرمایا ہے کہ مفتی اب سے آپ کا بھائی ہے۔ سو آپ کی چیزیں میرے برابر ہے اور میرے دل میں آپ کے لیے بلدرانہ محبت ہے۔ میں ہر طرح بھائی کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔ بھائی جان سے بات کرنے کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون اور اطمینان محسوس کیا۔

رقت کے دورے اسی روز نغمہ ہو گئے اور پھر وہ مجرمہ رہمنا ہوا جو اس واقعہ کا حاصل تھا۔ اسی روز جب میں بھائی جان سے مل کر گھر واپس جا رہا تھا تو میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر بہت احتل پھل ہو رہی ہو، جیسے اندر کاحد و ارع بدل رہا ہو۔

پھر میری لگاہ سڑک کے کنارے اُگے ہوئے درخت پر جا پڑی۔ میں نے محسوس کیا

جیسے درخت کے پتے پتے پر اللہ لکھا ہوا ہو۔ پھر مجھے بالذین کا وہ مضمون یاد آگئی ”سبز پتے کا
محیرہ۔“ پھر جو میں نے نکاہ اٹھائی تو بتؤں میں سے اللہ میان جھانک رہے تھے۔ میں گھر گیا۔
میں نے نکاہ پھیری۔ آسمان پر بلکے بدل تیر رہے تھے۔ ان بادلوں سے اللہ میان میں طرف
مجبت بھری نکاہ سے دیکھ رہے تھے۔ پھر جیمز جنریز کی ”کائنات“ میرے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ میرے
روبرو کائنات اپنی تمام دعویوں اور عظیموں سیمیت رومنا ہو گئی۔ عقب میں ایک نور ابھرا اور
دیکھتے ہی دیکھتے سمد کر اللہ بن گیا۔ میرے چاروں طرف اللہ ہی اللہ ہو گیا۔ زمین، آسمان، شجدہ جو
انسان، جانور ہر جیز پر سے گویا پردہ اُٹھ گیا۔ یخچے اللہ میان مسکرا رہے تھے۔ میرے شبہات
وسو سے، عقل، دلیل سب کی دھیان اُٹ گئیں۔ اللہ تعالیٰ میرے رو برو کھڑے تھے۔ ساری دُنیا
سمد کر اللہ بن گئی اور میں ہیزان کھڑا دیکھ رہا تھا، دیکھا رہا۔ میرا رُخ بدل چکا تھا۔
اور رُخ کا یوں آپ ہی آپ بدل جانا میرے نزدیک سب سے بڑا محیرہ ہے۔

عورت اور جنسیات

جنسیات کی رو سے جسم کا وہ حجم جو خواہشات پر اثر نہیں رکھتا، محض دکھاوا ہے۔

جسم سے جسم کی صرف بیردنی شکل مراد لینا اور انسان کو مرد اور عورت میں تقسیم کرنا غلطی ہے۔

ترتیب دینا بذاتِ خود محدود تصور کا وصف ہے، اور انسانی تنقیل کے عجز پر وال ہے۔ فطرت ترتیب سے بلند تر اور بیگانہ ہے۔ چونکہ ہمارا تنقیل محدود ہے، ہم غیر ترتیب شدہ کائنات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے چیزوں کو سمجھنے کی خاطر اپنی آسانی کے لیے یہیں ایک نہ ایک ترتیب ایجاد کرنا پڑتا ہے، اور پھر اپنے عجز پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر اصول کے ساتھ سمتیں کی کلی ٹانکی لازم ہو جاتی ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ مرد اُسے کہتے ہیں جو بغاہ مرد نظر آئے، یا جس نے پگڑی باندھ رکھی ہو۔ لیکن جسم کی بیردنی شکل یا پگڑی قابل اعتبار نہیں۔ ڈھکے ہوئے مرتبان کو دیکھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں مرتا ہے یا اچار، لیکن یقین سے نہیں کہ سکتے۔ کبھی کہ ہیئت نہیں کی بات پر اعتبار کر لینا درست نہیں۔ تو جسم کی بیردنی ساخت سے اندر دنی خواہش کا صرف اندازہ لگایا سکتا ہے جو کسی صورت میں یقینی نہیں ہو سکتا۔

کسی فرد کا مرد یا عورت ہونا ان خواہشات پر مبنی ہے جن کا حامل جسم ہوتا ہے جنسیات کے گورکھ دھندرے میں ہیں کئی ایک بالوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ مثلاً جسم کی بیردنی اور اندر دنی ساخت، آرزویں، شعوری اور لاشعوری، اور وہ رجحانات جو ہو یہاں نہیں ہوتے بلکہ تناک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ موقع میں تو بھپٹ کر کسی انفرادیت پر چا جائیں۔

جنیات کے اس الجھاڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم دلوں سے نہیں کہ سکتے کہ فلاں جنس کون سی ہے اور فلاں کرن سی، اور کسی ایک جسم میں فلاں جنس کماں سے شروع ہوئی اور کماں ختم۔

کہتے ہیں، پرانے زمانے میں مرد اور عورت ایک جسم میں رہا کرتے تھے۔ آثار قدیمہ سے بآمد کیے ہوئے تھے بُت، سکے اور پُرانی کتابیں اس امر کی شاہد ہیں۔ پھر زبانے کس بات پر دلنوں کا جھگڑا ہو گیا، اور وہ اس افراتغیری میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے کہ ایک کی کئی ایک جیزیں اور خصوصیات دوسرے کے پاس رہ گئیں۔ بھی سے ہر جسم میں عورت اور مرد کی خصوصیات خلط ملٹ ہو رہی ہیں۔ ہر مرد میں ڈارچی موچھ کے باوجود عورت گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہے۔ اور ہر عورت کے گھونگھٹ تکے مرد چھپا ہوا ہے۔ یعنی کسی فرد کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں مرد کماں ختم ہوا اور کماں عورت ابھر آئی۔ مرد اور عورت کی گزشتہ لڑائی آج بھی جلسی صند کی صورت میں واضح ہے۔

مرد کے جسم میں نسائیت کا نفرذ کبھی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس میں ظاہری مرد کے علاوہ کوئی اور مردانہ صفت نہیں رہتا۔ یعنی وہ صرف مردم شماری کا مرد رہ جاتا ہے۔ یہے زنانہ مرداکش دیکھنے میں آتے ہیں جنہیں دیکھ کر لوں محسوس ہوتا ہے گویا مٹی کی ہندیاں فیس کریم رکھی ہو۔

یہ اختلاطِ جنسی صرف ذہنی اور جذباتی خصوصیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ جسمانی اعضا تک پہنچ جاتا ہے۔ کئی ایک نرود میں اندٹے دنیاں لیکھتی ہیں، اور کئی ایک ماداں میں ٹھیک ہے۔

عورت میں مردانہ پن عام سی، لیکن عام طور پر اس قدر تیز نہیں ہوتا کہ اسے نسائی کردار یا تلقمنے سے بے نیاز یا بیگانہ کر دے۔ غالباً اس کی یہ وجہ ہے کہ تسلیم حیات نیادی تر عورت کی ذات سے والبستہ ہے۔ اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کائنات کا مقصد بنیادی طور پر

تسلیل حیات ہی ہے۔ اس لیے عورت کا جسم براہ راست علم الحیات کے اصولوں یا قانون پر چلتا ہے، جس کے احکام نفس غیر شاعر کے ذریعے عورت تک پہنچتے ہیں، جن پر عمل کرنے پر وہ ابزی طور پر مجبور رہے۔ اسی وجہ سے عورت کی انفرادیت اس کے عورت پر چاہی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کی انفرادیت کے صرف وہ پلوشونا پا سکتے ہیں جو اس کے فرضی اعلیٰ یعنی تسلیل حیات میں رخنے والیں بلکہ مدار معاون ثابت ہوں۔

یعنی مرد کی نسبت عورت پر جنسیت زیادہ غالب ہے، اور جب اس کا عمدہ نمائیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرے تو وہ بذاتِ خود مغلوق ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کے نقار خانے میں طوطی بن کر رہ جاتا ہے۔ لکھنی بار بار اہل جھٹکنے کے لیے اُٹھتی ہیں اور پسٹ جاتی ہیں۔ نفرت سے کھوٹا ہو جسم اپنا آپ حوالے کر دیتا ہے۔ چھرے کی زردی چھپانے کے لیے گال شرم سے متاثر ہوتی ہے۔ ٹھکنی ہاری ٹانگیں ٹھکنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

آج جب کہ عورت علمی و ادبی سے لے کر سیاسی میدان تک نہ صرف ہر دوں کام تاب مکر چکی ہے بلکہ کئی ایک شاہزادیوں پر مرد سے کمیں آگے نکل گئی ہے، مرد اور عورت میں ایسے امتیازات پیدا کرنا شاید جہالت سمجھا جائے۔ اس لیے یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس تفڑی سے میرا یہ مطلب نہیں کہ عورت ان خصوصیات کی اہل نہیں جو آج تک مرد سے منسوب ہوتی رہیں۔ بلکہ اس کے بعد پنکڑہ تسلیل حیات کی ذاتے دار ہے، جس کے لیے اسے مرد کو تصحیر کرنا ہوتا ہے، اس لیے وہ ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو ہر سانچے میں ڈھال سکتی ہے۔

تسخیر مرد کے عمل میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ قلعوں کی سی تصحیر نہیں کر بلکہ گھوڑے لیے آئے اور محاصرہ کر دیا۔ یا تصحیر غرناطہ کی طرح واپس جاتے کی کشتیاں جلا دیں۔ بلکہ یہ عمل ”تسخیر ٹرانس“ سے ملتا جلتا ہے جس میں تولپوں اور ہمچنیاں کی بجائے ایک خوبصورت لکڑائی کے گھوڑے کی ضرورت پڑتی ہے، جسے مخصوصاً دیور تباہ کر آپ

شہر میں گھسیٹ کر لے جائیں۔

قدرت نے عورت کو صرف تسلیخ کرنے پر مامور نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی طریقہ تسلیخ بھی متفقین کر دیا ہے۔ قدرت نے عورت پر زیرِ دستی بیٹھنی پیسیئر فی مایڈ کر دی ہے ورنہ اگر وہ زبردست جنس بنادی جاتی تو شاید تسلی حیات کے سوا یہاں اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا۔ فطری طور پر عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے پیار کرے۔ اور پیار دہی کر سکتا ہے جو محمد کا اہل ہو۔ کیونکہ محبت کرنا فاعلیٰ جذبہ ہے اور ایسا فعل لازم ہے جو کرنے والے سے تعلق رکھتا ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ کسی محظوظ کا ہونا لازم ہے۔ یعنی مرد عورت کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ پاہے وہ جاندار ہو دیا بے جان۔ اس کے برعکس عورت کی خواہش ہے کہ کوئی اسے پیار کرے۔ یعنی وہ ایسا "محظوظ" نہیں بنا سکتی جو جاندار یا فاعلیٰ نہ ہو۔ مرد کے لیے محظوظ کا صرف ہونا وصال کے متراadt ہو سکتا ہے۔ لیکن عورت کے لیے نہیں، جب تک کہ محظوظ کا عمدہ اور آرزو اس کی طرف مائل نہ ہوں اور محظوظ کو محبت کرنے پر مستقبل نہ کریں۔

مرد صرف یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنا آپ اس کے حوالے کر دے۔ وہ اس کی نفیت پر چھانا نہیں چاہتا۔ لیکن عورت کے لیے فقط مرد کا ہونا کافی نہیں، جب تک مرد کا عمدہ اور آرزو اس کے لیے وقف نہ ہو جائے۔ تو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے مرد کا جنم مقصود نہیں بلکہ اس کا عمدہ اور آرزو ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس کی نفیت پر چھانا چاہتی ہے۔

جب مرد کے دن موجودہ زمانے کے خود ساختہ اقتصادی چھیلوں میں کٹ جائیں، شام تفریح گاہوں کی بھینٹ ہو جائے، اور کل کا کام سر انجام دینے کے لیے رات کو گھری نیند ہونا لازم ہو جائے تو عورت بے چاری چوہا پھوڑ کر کھٹ گراؤنڈ، کانفرنس، یا بارٹری، فیکٹری اور طیارہ گاہ میں نہ آئے تو تسلیخ مرد کا کام کیسے سر انجام ہو۔ چنانچہ اس فطری فرض کو ادا کرنے کے لیے وہ اپنا میدانِ عمل وسیع کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے علاوہ ہر "محظوظ" کا

یہ فرض ہے کہ ماشیت کی آرڈر کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ چاہے اس کا نظام آرڈر بدل دے تاکہ وہ اُسے پیار کرنے لگے یا اپنے آپ کو اس نظام آرڈر کے مطابق بنائے تاکہ اس کے لیے جاذب توجہ ہو جائے۔

پنجاب میں بھی مرد کے بڑھتے ہوئے انہاں کے خلاف عورت کی صدائے احتجاج خونیں لباس کی شکل میں بلند ہو رہی ہے۔ حالانکہ عورت اس امر سے قطعی ناداقف ہے کہ سُرخ کپڑے کو دیکھ کر سانڈکیوں جوش میں آ جاتے ہیں۔ بیاہ شادی پر سُرخ جوڑے کیوں پہنے جاتے ہیں، اور مندرجہ لگانے کا کیوں رواج ہے۔ نہ جائے نفسِ غیر شاعر جھاک کر کان میں کیا کہ دیتا ہے کہ وہ بن سمجھے جانتی ہے اور بن جانے سمجھتی ہے۔

عورت کی قوتِ تسمیہ کا یہ عالم ہے کہ وہ باختہ پاؤں ہلاسے بغیر چند ایک ان جانی حرکات کی مدد سے مرد کو دُنیا تے عقل و شور سے گھسیٹ کر دُنیا تے جذبات میں لکھنکتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں انگارہ ہو جاتی ہیں، اور جسم بھکاری۔

فطری طور پر مرد اس کھلنڈرے لڑکے کی طرح ہے جو مرد سے سے بھاگ کر باہر آوارہ بھرتا پیند کرتا ہے۔ عورت مرد کو واپس گھر لاسکتی ہے، لیکن گھر کا نہیں کر سکتی۔ اگر مرد بسا ادقات یا عام طور پر باہر آوارہ بھرے تو عورت کو بھی کرکٹ گراڈنڈ، فیکری یا طیارہ گاہ میں جانا ہی بپڑتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ عورت کی کرکٹ اور طیارے میں پچھپی بالواسطہ نہیں بلکہ ایک حقیقی اور مشتبث شوق ہے تو یہ ماننا پڑتے گا کہ عورت کی نظری خصوصیات میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اس کی انفرادیت مرد کی جنسیت پر حادی ہوئی جا رہی ہے۔ لیکن بھر بھی ہم یقین سے نہیں کہ سکتے کہ عورت کی یہ تبدیلی کس حد تک تسلیم حیات سے انحراف کے متراود ہے۔ شاید وہ مستقبل کے مرد کے ماحول اور جذبات کے مطابق تپھیل نہیں ہو، تاکہ آئندہ تسمیہ مرد ناممکن نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر مرد گھر توڑنے کی نکر میں ہو، حیا کو نا اہلیت سمجھے اور ذہنی چمک کو نسائی اُب پر ترجیح دینے لگے تو عورت ہر چاٹت!

خود نہیں اور ذہانت کو نہ اپنائے تو کیا کرے۔

تو اگر ت کے موجودہ نظریے کے مطابق مرد کی ترتیب مخلوط سمجھی جاتی ہے، اور عورت کی مفرد مثلاً اگر مرد ع ک ہے تو عورت ع ع۔ عورت کے کسی موروثی رجمان یا خصوصیت سے اثر پذیر ہونے کے لیے لازم ہو گا کہ وہ خصوصیت دونوں ع پر موجود ہو، دریں صرف ایک ع پر موجود ہونے کی صورت میں وہ خصوصیت اس پر حادی نہ ہو گی بلکہ مخفی ہو گی۔ وہ بذاتِ خود اس خصوصیت سے متاثر نہ ہو گی بلکہ اسے اپنی نزدیکی اولاد میں باعث سکے گی۔ جیسے مچھری زیست خود ملیریا کام ریض نہیں ہوتا لیکن اس مرض کو پھیلا تاہے۔ اس کے بعد میں تو اُرٹی رجمان مقابلتہ ہریدا ہو جاتا ہے تو ظاہر ہوا کہ عورت میں مرد کا فوڈ چاہے کسی حاٹک ہوا وہ مقابلتہ عورت کے فرائیق جینی سے گریز نہیں کر سکتا۔ عورت میں نسائیت کا عنصر دوسرے عناصر سے غالب تر ہے، اور مرد کی تسبیح اس کا سب سے بڑا دوامی اور بخیر شوری جد رہے۔ باقی اوصاف مثلاً حیا، زیر دستی، نزاکت وغیرہ جو اسے تسبیح میں مدد دیتے ہیں، بالواسطہ ہیں، جو حالات اور ضرورت کے مطابق بدل دیے جاسکتے ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ یہ ضمنی خصوصیات فیشن کے مطابق ادنیٰ بدلتی رہی ہیں۔

کہتے ہیں، پرانے نامے میں، جب بے جانی کا دور دورہ تھا، مرد عورت کی بے باکی سے اکتا گیا۔ اس کے جنسی جذبات آزاد جنسی ماحول اور روزمرہ استعمال کی وجہ سے اس قدر ٹھنڈے پڑ گئے کہ کسی بے حیا عورت نے ضرورتِ وققی کے ماتحت اسے از بر تو اس نے کے لیے حیا ایجاد کر لی، جس طرح برہنگی کے زمانے میں کسی چالاک اور بے حیانے کپڑے ایجاد کیے تھے۔ تو ظاہر ہوا کہ کوئی خصوصیت، چاہے ہم اسے نسائیت کا جزو لایں گا، ہی سمجھتے ہوں، بذاتِ خود نسائیت سے اہم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نسائیت کے اہم ترین عقدہ تسبیح مرد، کے تحت رہتی ہے۔ اگر آج عورت زیر دستی چھوڑ کر غالبت انتیار کرے تو بھی تعجب کی بات نہ ہو گی۔ کیونکہ شاید ضرورتِ وقت ایسی ہو۔ بہر حال، دیکھنے میں آتا ہے کہ

آج کل مرد میں زیر دستی بڑھ رہی ہے اور مقابلۃ عورتیں بے باک ہو رہی ہیں۔ عورت کی ادنیٰ تین تبدیلی، چاہے وہ لباس سے تعلق رکھے یا انداز سے، مرد کی کسی چھپی ہوئی یا منایاں آرزو کا پرتو ہوتی ہے۔ اس کے بر تاؤ کی کمترین تفصیل بھی اس کے دل کی عین ترین گمراہیوں میں وضع ہوتی ہے۔ اسی بات پر نوجانے کس نے بحث کا اعتمام کرتے ہوئے کہا تھا :

”بیگم صاحبہ، آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ عورت طفیل اور زنگین تر مخلوق ہے اور مرد بھتی مخلوق۔ لیکن مرد کے نظام آرزو پر عورت حادی ہے اور عورت کی خواہشات پر مرد حادی ہے۔ یعنی مرد کی خواہشات ان تمام تر طائفوں اور زنگینیوں سے عورت ہیں جو عورت سے والبستہ ہیں، اور عورت کی آرزوؤں پر مردانہ بھتی اپن چھایا ہوا ہے“

”حیات“ کے پیام یا احکامات لا شور کے ذریعے نشر ہوتے ہیں، جو عزم اور عمد کا مرکز اور منبع ہے اور جس میں ایسی گھری حیاتی قویتیں موجود ہیں جو ماحدی اور وقت سے قطعی بے نیاز ہیں۔ چونکہ ”حیات“ کو براہ راست عورت سے زیادہ گھر تعلق ہے، اس لیے عورت کی زندگی زیادہ تر نفس لا شور کی مذہم تال پر چلتی ہے۔ انسانی عقل صرف وہی بات سمجھ سکتی ہے جس میں کوئی نظام دکھانی دے، اور جو ماحدی سے تعلق رکھے۔ شاید اسی لیے عورت کا بر تاؤ آج تک ناقابل فہم سمجھا گیا اور اسے الہامول سے تشبیہ دی گئی، جس کا جسم انسانی اور حیوانی اعضا سے مخلوط ہے۔

عورت کی نفیت اس شخص کی سی ہے جو درُخے مراج کے عارضے کا شکار ہو، کیونکہ اس کی نفیت پر کبھی انفرادیت حادی ہوتی ہے اور کبھی نمائیت۔ لیکن عورت کو اپنے درُخے پن کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ نمائیت کا رُخ لا شوری اثر رکھتا ہے اور انفرادیت کا شوری۔ نمائیت کے رُخ کلا شوری رکھنے کا مقصد اسے تلمی، افعال اور پیشگانی سے محفوظ کر دیتا ہے کیونکہ قدرت کمیں کمیں قوت اور وقت کے بینا تعریف سے احتراز کرتی ہے۔ اس کے ملاude شوری حرکات میں وہ رس نہیں ہوتا۔ اگر اسے احساس ہو کہ وہ تنفس کر رہی

ہے، ہر مسکراہست پر جان لے کر ہنٹوں کی مدد سے مبہم و عدے کر رہی ہے یا اسیے ہی بھی نفع انسان کو جینے کی ترغیب دے رہی ہے اور جینے کے سیدھے سادے عمل میں لگ بھر رہی ہے تو یا تو وہ اس فطری پابندی کی قید کے خلاف بناوت کر دے اور یا مرد و تجہ اخلاق کے زیر اثر اس قدر پیشمان ہو کہ احساسِ گناہ سے دب کر رہ جائے، یا شاید ان وضعی پابندیوں کو چھوڑ کر اپنے فطری فرض کو علانیہ اپنالے۔ ہر صورت میں توازن قائم نہ رہ سکے گا جو بڑی حد تک مرد عورت کے مقدس طاپ کو قابل آرزو بنانے کا ذمہ دار ہے۔

پر یعنی ساختی ہونے کے باوجود مرد اور عورت دو اجنبی ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے پیغام اور دعوتِ حیات بن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مکمل طور پر ایک دوسرے سے واقع نہیں ہوتے بلکہ چاند کی طرح صرف ایک پہلو پیش کرتے ہیں۔

عورت کا اہم ترین مقصد تیزی ہے، اور وہ اس مقصد کو پیش پیش رکھتی ہے تو مرد کا صرف وہ پہلو دیکھتی ہے جو تیزی ہونے سے تعقیل رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس مقصد سے بے نیاز اور بے داسطہ ہو کر نہ تر دنیا کو دیکھ سکتی ہے، نہ اپنے آپ کو۔ ہاں، اپنے بچے کو دیکھ کر اسے بے لاک خوشی ہوتی ہے، جیسے کہی تراہی مسراں مقصود پر پہنچ گیا ہو۔

خوشی حاصل کرنے کے لیے تلخ حقائق سے محفوظ ہوئیا تو مرد اور عورت دونوں میں موجود ہے لیکن مرد حقائق سے زیادہ دیر تک جی نہیں چڑا سکتا بلکہ جلد ہی ناخشکوار حقائق کے خلاف جدوجہد کرنا شروع کر دیتا ہے یا کم از کم ان کے وجود کو تسلیم کر دیتا ہے۔ لیکن عورت عمر بھرا بھی خیالِ دنیا میں بس کر سکتی ہے، کیونکہ اس کا تصور اس قدر مکمل ہوتا ہے کہ ہر متصوّرہ بات اس کے احساسات پر واضح اثر چھوڑ جاتی ہے، جیسے کہ تیققی مشاہدہ۔ بلکہ اگر وہ حقائق سے بے نیاز رہتے کافی مصلحت کر لے تو کوئی حقیقت، چاہے وہ رو بروہی کیوں نہ ہو، اس کے احساسات پر اثر لانداز نہ ہو سکے گی۔

لڑکے کو مرد بننے ملک گرگٹ کی طرح کئی ایک رنگ بدلتے پڑتے ہیں۔ لیکن لڑکی پیدا ہوتے ہی مکمل خورت ہوتی ہے۔ اگرچہ بلوغت اس کے نسائی انداز میں رنگ بھروسی ہے اور ان غیر شعوری رجحانات کو جو پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں، نمایاں کر دیتی ہے۔

ابتداء میں لڑکے میں نسائی جھلک ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد خورت بڑھاپے میں مردانہ خصوصیات پیدا کر لیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسائیت ایک ایسا عضر ہے جو جھوپل کی خوبصورتی طرح اڑتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک عمر میں خورت صرف دلکھنے کی خورت رہ جاتی ہے۔ اس وقت اس میں نسائیت مدھم پڑھ جاتی ہے اور ساتھ ساتھ انفرادیت اُبھرتی آتی ہے۔ بڑھاپے میں خورتوں کے ڈارچی مورچے تک نکل آتی ہیں۔ مزاج میں مردانہ درستی، شدید نمائیت اور بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔

تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑتی ہے۔ حاکم خورتیں بڑھاپے میں مردانہ وار حکومت کرتی رہیں۔ شاید ملکہ الزینۃ اور میری سکات اسی لیے دو مختلف قصے ہیں کیونکہ الزینۃ میں انفرادیت تھی اور میری نسائیت کے رنگ میں بھی ہوئی تھی۔

کسی بھروسی بھی کو "تا" کا کھیل کھیلتے ہوئے دلکھیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے کھیل نہیں سمجھتی۔ کیونکہ زندگی میں "تا" اس کے لیے سب سے بڑی حقیقت ہے بلکہ حقیقت میں زندگی اس کے لیے ایک سلسل "تا" ہے۔ صرف اس کی زبان ہی "تا" نہیں کہتی بلکہ تمام جسم اس دلچسپ عمل میں زبان کا ساتھ دیتا ہے۔ لڑکا اس کھیل میں اس قدر دلچسپی نہیں لیتا۔ اس کی چالاک مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ مذاق کر رہا ہے۔ لڑکے کو ایسے کھیل پسند میں جس میں کسی کو ستانے، دنکرنے اور پیٹنے کا موقع ملے۔

اگر "تا" کے کھیل میں لڑکی کا ساتھ نہ دیا جائے تو وہ سچ مج رُدمٹ جائے گی۔ اس کی "تا" والی نگاہ میں بچوں کا کھیل نہیں بلکہ دیدہ بنتا کی جھلک نظر آتی ہے۔ تجھب کی بات ہے کہ جس قدر "خیا" کا انہمار آٹھ نو سال کی بچی میں پایا جاتا ہے، بالغ لڑکی میں نہیں ہوتا۔ شاید

اس عمر میں قدرت انھیں مشق کرنا سکھاتی ہے یا بلوعہ میں خواہ تواہ نہ سرا جانا عمریاں اپل کا احساس دیتا ہو۔

آنھٹیوں یا نویں سال میں بچپن اس بات پر مصروف ہوتی ہیں کہ انھیں مکمل عورت مان لیا جائے۔ وہ بڑی لڑکیوں کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتی ہیں، اور ان کی سی باتیں اور انداز پیدا کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے انھیں بالغ لڑکیوں کی برتری کا احساس ہے۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتی ہیں کہ وہ بالغ ہیں، ان سے محبت کی جاسکتی ہے۔ اس لیے وہ بے تحاشا جھیپنتی ہیں۔ اپل کی مشق کرنے کے لیے عام طور پر وہ کسی بڑے مرد کو چھتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی عمر کے لڑکے اس بارے میں بے حس ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات کچھ ایسی ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہو "اب تو یہ جوان ہوں" یا "میں سب جانتی ہوں" حتیٰ کہ دریکھنے والا بزرگ پر لیشان ہو جاتا ہے اور بچہ جان پھر طالنے کے لیے سہنس کر کرتا ہے "یہ بچے! — بے چارے معصوم!"

چونکہ عورت کا برتاؤ زیادہ تمرد کے لیے وضع ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ مرد یا محبوب کی پسند کے مطابق ہو۔ چونکہ ہر جگہ کے مرد ایک سے نہیں ہوتے، اس لیے یہ جگہ علیحدہ انداز اپل پیدا کیا جاتا ہے۔ مثلاً یورپ میں، جہاں آج کل ذہانت کا دور ہے، عورتیں اپنے انداز اور جذبات میں ذہانت کی جگہ پیدا کرنا جان چکی ہیں اور ذہانت کی گھرائیوں میں جائے بغیر ایک خوبصورت ذہین انداز پیدا کرنے میں کمال حاصل کر چکی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک بیسویں بھی اپنے اس بھی ملائقتی کو ہمدردی کا احساس دے کر اس تخت ملکاپ میں فرمائی رفاقت کا طلسم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد، شاید اس لیے کہ پاکستانی مرد غم خور عاشق کا پارٹ ادا کرنے سے خوش ہوتا ہے، پاکستان کی عورت بے نیازی اور لاپرواں کی اپل پیدا کرتی ہے۔ لیکن حالات بدل رہے ہیں۔ بدلے دفا اور عزت کی اپل پیدا کرنا لازم تھا، جس پر بے نیازی کا سماں کا خوب رہتا تھا، لیکن اب مغربی نقطہ نظر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ الگچہ

ابھی مغربی اپیل کی خوبیاں پورے طور پر دیکھنے میں نہیں آتیں چونکہ عورت اور مرد کو مل بیٹھنے کی اجازت نہیں، اس لیے یہاں کی لوگوں کی اپیل کے ان طور طریقوں سے محروم ہے جو نور پر بیٹھ کر عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً گاؤں میں یا موڑ میں بیٹھ کر وہ ہنگلوں کے پردے میں میں بار بار ایک دوسرے سے ٹکرانے یا لمس کا احساس دینے کی اپیل پیدا نہیں کر سکتیں، اور سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنے کی اپیل سے قطعی محروم ہیں۔ اس لیے ان کی اپیل زیادہ تر چھپ جانے، گھونٹھٹ نکال لینے، شرما جانے اور جھینپ جانے تک محروم رہی۔ ظاہر ہے کہ جن قیود میں انہیں تحفظ کے لیے ڈالا گیا، انہوں نے ان ہی قیود اور رسومات کو اپیل کا ذریعہ بنایا تاکہ دستی داری کی دستی داری رہے اور اپیل کی اپیل۔ اس کے علاوہ آہستہ آہستہ کئی اور انداز اپیل پیدا ہوتے گئے۔ چنانچہ لوگوں نے اس سلسلے میں چھوٹے بچے کے وجود کو بہت مفید مطلب پایا۔ کیونکہ وہ دور کھڑی ہو کر بچے کو کھلانے کے بھانے اسے چھاتی سے لگا سکتی تھیں اور اس کا مٹھ جوہم سکتی تھیں۔

عورت کا برتاب، حرکات، انداز، فیشن، لباس اور شاید اخلاق بھی اپیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی گاؤں تھنوں تک لٹک جاتے ہیں اور کبھی گھٹنوں تک شکڑ کر پینڈیاں عربیاں کر دیتے ہیں۔ آستینیں ناخنوں تک ڈھنک آتی یا منڈھے اور گلائیاں ہو کر گورانگ نمایاں کرنے والا سٹک کی طرح شکڑ کر جنم دیج داضع کرنا شروع کر دیتا یا سیاہ ہو کر گورانگ نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مغرب میں پیٹ بھرنے والا کھانا گھر کھایا جاتا ہے اور حسین حرکات وال اعلیٰ میں۔ شاید شرقی عورت کا نہ ہے اور خدا بھی پاکری گی کی اپیل کا ایک ذریعہ ہو۔ مغرب میں تو عورتوں کے خیالات اسوسیلزم اور ذہنی چک مخفی اپیل کا انداز ہے۔

یورپی تہذیب کے زمانے میں عورت کا بھرا ہوا جسم خوبصورت سمجھا جاتا تھا تو عورتیں مٹیاں رہتی گئیں۔ آج کل پتے جسم کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے عورتیں دُبلا پتلا ہونا سیکھ رہی ہیں۔ یورپ کے مردوں نے پیروں کی خوبصورتی کی طرف توجہ دی تو ایک دم پاؤں کی

خانقت کرنا فیش میں آگیا۔ اُپنی ایڑی سے پاؤں کا خم نمایاں رکھا جانے لگا لیکن اس سے یہ قباحت نکلی کہ پنڈلیاں موٹی ہو گئیں۔ اب نہ جانے انھیں سڑوں کرنے کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا جائے گا۔

پاکستان میں آج کل عورت کے لیے صادی حقوق کا عالم بلند ہو رہا ہے۔ جماں تک شرعی اور سیاسی حقوق کا تعلق ہے، شاید مساوات ممکن ہو، لیکن مرد اور عورت کے جنسی تعلقات میں مساوات ممکن نہیں۔ عورت کا عجوب صرف وہ ہو سکتا ہے جو ذاتی عمد کا اہل ہو۔ عورت کی خواہش مرد کے عمد کو تسریخ کرنا ہے، جسم کو نہیں۔ اور اسے بذاتِ خود حصول سے اس قدر بچپی نہیں جس قدر کہ عمل حصول سے۔ اگر مرد محبت میں اپنی انفرادیت اور عمد کھودے تو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے اسے تسریخ کرنا بے معنی ہو جائے گا۔ اس لیے وہ ایسے عجوب میں چندال دچپی نہ لے گی۔ چنانچہ مرد کے لیے عورت سے اس قدر محبت کرنا جس میں اپنا اپکھو جائے، خود کشی کے متراوٹ ہے۔ عورت سے محبت کرنے میں صرف وہی فرد کامیاب رہتا ہے جو تسریخ ہونے پر کامادہ دکھانی دے، لیکن مکمل طور پر مسخر نہ ہو۔ یا کم از کم ایسا اثر پیدا کر سکے جس سے ظاہر ہو کہ اس کا ایک حصہ ابھی قابل تسریخ ہے۔ ان حالات میں عورت صرف اسی کا ہونا گوارا کرے گی جسے وہ اپنے اپ سے بلند تر سمجھے گی۔

بھر جال، الیسی صورت میں عورت اور مرد میں صرف دو ممکن تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔ یا تو مرد غالب ہو گا یا مغلوب۔ لیکن یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ عورت کو مغلوب کر لیتے کے بعد بھی مرد اس سے محبت کر سکتا ہے (بلکہ شاید وہ مغلوب سے زیادہ محبت کرتا ہے) لیکن مغلوب ہونے کے بعد عورت اسے پرانے کھلونے کی طرح پھینک دے گی اور پھر اس میں قطعی طور پر دچپی نہ لے سکے گی۔ شاید اسی وجہ سے عورت اور محبت میں ایک تباہ گئ کش کش پیدا ہو چکی ہے۔ اسی پیے تو کہا جاتا ہے کہ عورت سائنس کی طرح ہے۔ تم اس کا پیچھا کر د تو وہ دور بھاگے گی، اور تم دُور بھاگو تو پیچے پیچے آئے گی۔ اس صندکی وجہ سے

جو جو یچیدگیں اور دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بہر حال، اس کی محبت میں اپنا آپ کھو دینا اپنی شخصیت کے پروں کو جلا دینے کے مترادف ہے۔ ایسا فرد ترس کے سوا اس سے کچھ اور حاصل نہیں کر سکتا۔

مرد کی ذہنیت ایک سیدھے سادے دہقان کی سی ہے، مجھے آپ چودھری کہ کہ جو جی چاہے کر دالیں۔ اپنی خدمت میں لگا رکھیں تو بھی مضایعہ نہیں۔ مرد کو کوئی چودھری کے تودہ سمجھتا ہے کہ اسے چودھری تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اسے یہ نہیں سمجھتی کہ آیا اس سے چودھری کا ساسلوک بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ عورت نے صدیوں مرد کے ساتھ رہ کر اس کی نفسیت کو پالیا ہے اور وہ چودھری صاحب کو چودھری کہنے میں ذرا تال نہیں کرتی۔ نظرِ غائزہ سے دیکھا جائے تو ساری حقوق و مختلف جنسیوں کے لیے بذاتِ خود سب سے بڑی بے انصافی ہوگی۔ اول تو مساوات میں توازن ممکن ہی نہیں۔ اگر ممکن بھی ہو تو مساوات توازن پیدا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ توازن صرف "جس کا کام اسی کو ساجھے" کے اصول پر قائم ہو سکتا ہے۔

عورت کے جسم میں جنسی خواہشات صرف جنسی اعضا میں مرکوز نہیں، جیسے کہ مرد کے جسم میں۔ یعنی مرد کی جنسی زندگی روزمرہ زندگی سے مختلف چیز ہے۔ اگر مرد کی عام زندگی کو ایک اندر ہیری سڑک تسلیم کر لیا جائے تو اس کی جنسی آر زد وہ مدعی تباہ ہوں گی جو یہاں دہاں دُور دُور چکلتے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن عورت کی جنسی اور روزمرہ زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ عورت میں جنسی پہلویوں چاروں طرف پھیلا ہو رہا ہے۔ جیسے صبح صادق کا اجالا یا کسی جدید سینما میں روشنی، جہاں بتایا دھکائی نہیں دیتیں۔ اسی وجہ سے عورت کی زندگی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب اس کا بیاہ ہو جائے۔

تھے جانے یہ خیال کیسے عام ہو گیا کہ عورت کے لیے مرد کا اٹھا ری محبت چند مخصوص جسمانی حرکات تک محدود ہے۔ اگر یہی بات مرد کے لیے کہی جائے تو زیادہ گروزوں ہو گی۔

اس کے برعکس عورت اس بات کی خواہیں سے کہ اسے ایسے محبت بھرے ماحل میں رہنے کی خوشی حاصل ہو جیں کا تسلسل دھانی ہو۔ اگر چنان و ممکن ہو تو وہ کسی کی محبوبرہنے کو میارہ ہو گی، بلکہ ایسا جیون سا سختی ملاش کرے گی جو مردانہ خصوصیات کا حامل ہو۔ لیکن مشاہدے میں آیا ہے کہ مردانہ سیرت کو مردانہ جسم پر تبیح دی جاتی ہے، اور محبت کی مدھم لوکوں کو طوفانی جذبے سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اگر عورت کو اپنے چنانوں یا پسند کا ساختی نہ ملے تو یا تو وہ خیال کے زور سے اسے دیکھا شروع کر دیتی ہے یا اپنے خیالی محوب میں اس قدر کھو جاتی ہے کہ حقیقی ساختی کو دیکھنے تک کی تکلیف گوارا نہیں کرتی۔

مرد فاعلی فرد ہے، یعنی اس کی زندگی "کرنا" کے مترادف ہے۔ اس کی خوشی اسی بات میں ہے کہ وہ کچھ کرتا رہے۔ جلد و ہجد کرے یا روتی کئے یا قوم اور ملک کی خاطر جان دینے پر آمادہ ہو جائے۔

اب غم اور خوشی کو لیجیے۔ غم اور خوشی دو یقینتیں ہیں، جنہیں فعل سے تعلق نہیں۔ اس لیے عورت خوشی اور غم کو حقیقی طور پر جانتی ہے اور مردم مقابله ان سے بیگانہ ہے۔ مرد کے لیے زندگی افرادی یا ہمہ بھی کے مترادف ہے۔ درحقیقت مرد کو کچھ کرنے یا سراخاں دینے کے فعل سے دل چڑھی ہے۔ توجہ تک کش کش میں لگا رہے گاؤں اسے احساس رہے گا کہ وہ خوش ہے۔ لیکن عورت میں خوشی کا احساس بالواسطہ نہیں بلکہ مثبت جذبہ ہے۔ وہ خوشی سے یوں لطف اندوں زہدا چاہتی ہے جیسے بکری جگانی کرنے سے۔ اس کے برعکس مرد کو خوش ہونے کا احساس ہوا تو معاً بیٹھ رہنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اُنھوں بیٹھا چلنا پک نک پر چلیں، کبڑی کھیلیں، سینما دیکھیں یا نیچہ یہ ہو اکہ آپ کسی اور کام میں کھو گئے۔ خوشی کے احساس کی جگہ فعل نے لے لی۔

اب غفتے کو لیجیے۔ غفتہ ایک فعلی جذبہ ہے جس میں جی چاہتا ہے کہ کچھ تور طبھوڑ دیں۔ کوئی نہ سے کو درپڑیں یا چینی کی طشتری اٹھا کر دیوار سے دے ماریں۔ یہ غالباً مردانہ جذبہ

ہوا جس سے عورت بیگانہ ہے۔ مل، انتقام ایک سلسیل کیفیت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس یہ اس کی اہمیت عورت میں زیادہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر بخش دیتی ہے۔

جنی تعلقات میں مرد کی خوشی صرف دلوں تک محدود ہے، جسے تلذذ کرنے ہے۔ اور وہ بھی صرف اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہ توجہ کی کیفیت ہے۔ لیکن عورت کے دل میں خوشی کا مدو جذر لمبڑوں کی طرح تھام اور دوامی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مرد کو جنسی تعلقات میں اس یہ خوشی ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ عورت پر غالب ہے یا اس کی خوشی کا باعث ہو رہا ہے، اور اس۔

جهان تک جینے کا جذبات سے تعلق ہے، عورت جیتی ہے اور زندگی کی ہر خوشی اور ڈکھ کو ایک مادی چیز کی طرح محسوس کرتی ہے۔ جہان تک جینے کا کرنے سے تعلق ہے، مرد جیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کیفیتی لطف میں دوام ہے۔ شاید جسمی حساتما بھٹھنے نرداں کی عظمت اور خوشی کو محسوس کیا۔ نہ جانے حساتما بھی میں کس حد تک عورت جی رہی تھی۔

جزئیائی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو استوائی مرد اہل مغرب کے مقابلے میں زیادہ کیفیتی ہیں، اور اہل مغرب مقابلہ زیادہ فضیلی۔ استوائی علاقوں میں اس نگ دو کو تصور میں بھی نہیں لایا جاسکتا جو یورپ میں ہر سے پیش پیش رہتی ہے۔ کیونکہ ان علاقوں میں نباتاتی افزاد کو دیکھ کر یوں احساس ہوتا ہے جیسے قدرت آپ رہی اُکر آناؤ گوند کر رہتی پکا کر چنگیریں رکھ جائے گی۔ شاید اسی یہے تقدیر کا مسئلہ استوائی علاقوں پر حادی ہے لیکن اہل مغرب تقدیر پر پشاکر رہ کر بھجوکوں مرنے سے گھبراتے ہیں۔ نرداں کا مسئلہ صرف استوائی علاقوں میں ظاہر ہو سکتا تھا، مٹنڈے مالک میں نہیں۔

بھر حال، مرد فضیل انسان ہے اور اس کی زندگی ایک جذبے کے ماتحت نہیں گزر سکتی۔ اس کے نزدیک جذبہ کیفیت نہیں، بلکہ ایک ایسی عملی تحریک ہے جو اسے اٹھا کر بھادے اور کچھ نکھل کرنے پر مائل کر دے۔ اسی یہے مرد تغیرت پسند ہے، ہرجاتی ہے اور ملکوں میں ہج

ہے۔ اس کیے لیے نتھی چلنا ہے یا جلانا بُھنا اور پھر جل جانا۔ تاکہ پھر مجھ کو پھر جلنے کا امکان رہے لیکن عورت ایک جذبے کے تحت جی سکتی ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے جی سکتی ہے، اور بینے کی کیفیت پر حادی ہے۔ اس کے نزدیک خوشی اور فرم سردی اور گرمی کی سی مثبت اور مخصوص کیفیتیں ہیں، جنھیں وہ یوں محسوس کر سکتی ہے جیسے تبی پر لا تھوپھیر کر نرمی محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ سلگنا جانتی ہے، جلنائیں۔ البتہ وہ جل جاتے کوئی بخشنے پر ترجیح دے گی۔

لوک گانڈک

طفیل نیازی

غالباً ۱۹۴۳ء کی بات ہے، جب میں نے پہلی مرتبہ طفیل نیازی کو سنا۔ میں ایک قلم مزدور ہوں۔ مجھے بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ کچھ لانڈر روٹی کے لیے۔ کچھ ذہنی عیاشی کے لیے۔ ان دنوں میری عادت تھی کہ ریکارڈر پر کوئی ٹیپ لگالیتا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ موسیقی کے نور پر لکھتا رہتا۔ اس سے یہ اندازہ نہ لگایجیے گا کہ میں موسیقی سننا جانتا ہوں۔ اُو سنوں بیہ بات نہیں۔ میں موسیقی سے قطعی طور پر اینجان ہوں۔ بالآخر موسیقی سے شدت سے متاثر ہوتا ہوں۔

ایک روز میرے بیٹے عکسی نے مجھے ایک ٹیپ دیا۔ کہنے لگا ”ابو، یہ ٹیپ سُونو“ ٹیپ لگا کر میں لکھنے لگا۔ لکھتے لکھتے دفعہ دفعہ میں چونکا۔ ارسے مجھے ایسے لگا جیسے کوئی جیشی دُکھ اور مظلومیت پر کراہ رہا ہو۔ پیکار رہا ہو۔

اُن دنوں طفیل نیازی کی آواز میں اڑان تھی، پیکار تھی، دُکھ تھا، کرب تھا۔

گیت کے بول بھی عجیب سے تھے :

بول مٹی دیا بادیا وے تیرے دُکھاں نے ماں کا لیا

وے میرا سانول ماہی آجا ہو او او۔ آجا ہو او او

ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی بول سے بے نیاز ہے۔ ہاں، شوئین مراج لوگوں نے اپنادل خوش کرنے کے لیے زبردستی بولوں کو اہمیت دے رکھی ہے۔ آج کل وہ غزلیں سُنتے ہیں اور بولوں پر سرد حصہ ہیں۔ اور گانڈک اس بات پر بُرُّ انہیں مانا۔ غزل

گانے والوں کو دیہ احساس ہی نہیں رہا کہ بول، دھن اور آخاذ میں ربط کا ہونا ضروری ہے۔ بول اور دھن میں بے ربطی عام ہو چکی ہے۔ بول روتا ہے، دھن چکلیاں بجاتی ہے۔ یا دھن آہیں بھرتی ہے اور بول ناج ناچتا ہے۔

غزل کی گائیکی میں بھلا ربط کیسے پیدا ہو جب کہ غزل کے بہتر کاموں میں گفت کی طرح رنگ بدلتا ہو۔

اس روز طفیل کی دھن اور بولوں میں بلا کی ہم آہنگی تھی۔ اس لیے بول میں جان پڑا گئی۔ مجھے ابے لگا جیسے کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ :

بول، اے منی کے بنے ہٹرے ٹپٹے۔ یہ تو نے کیا کیا کہ اپنی زندگی کے معاملات کو اپنے ہاتھوں ال جھا کر خود کو دکھی بنالیا؟ تیرا دکھ بہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ بول ہمارے پیارے ماہی، بول۔ یہ تو تے کیا کیا؟ ہٹا، چھوڑ ان ملجنوں کو۔ ہمارے دوار پر اکھڑا ہو۔ اس ہم آہنگی نے میرے رُuber و ایک عظیم سچائی کو لاکھڑا کیا۔

پھر یہ بھی تھا کہ ان دنوں مجھے نیانیا عشق لگا تھا۔ ایک ان جانا، انکھا عشق۔ سامنے نجوب تھا، نزد صال تھا، نزد فراق تھا۔ غالی لگن ہی لگن تھی۔

زندگی بھر میں نے کئی ایک محبو بادل سے عشق کیا تھا۔ زندگی بھر خدا ہش کی انگی طھی سُکا گر بیجا اسے پنکھا کرتا رہا تھا۔ زندگی بھر میں بڑی محنت سے جگ جگ عشق لگاتا رہا۔ یکن یہ عشق قطعی طور پر مختلف تھا۔ یہ عشق میں نے نہیں لگایا تھا۔ لگ گیا تھا۔ پتا نہیں، کیوں، کیسے۔ اس روز طفیل نیازی کے گیت نے ایک کیفیت پیدا کر دی۔ ایک سرشاری۔ یوں جیسے مٹی کا بادا کسی دوار پر جا کھڑا ہوا ہو۔

صرف ایک گیت کی بات نہیں۔ اس ٹیپ میں طفیل کے بیشتر گیتوں کا رنگ تاثر بھرا تھا۔ بول زخمی پرندے سختے۔ دھن دکھ میں بھیگی ہوئی تھی۔ ایک گیت کے بول تھے:

درداں مار لیا دے، میرا دل ڈردا نہ بچے

ایک کامھڑا تھا :

سجناء دھچوڑا تیرا جند نہ سمار دی

سارے ٹیپ میں ایسے ہی گیت بھرے ہوئے تھے۔ یہ ٹیپ کسی ادا سے نہ پردہ ڈیوس نہیں کیا تھا۔ ادارے جب بھی کوئی گانا پردہ ڈیوس کرتے ہیں تو اسے بن سجا دیتے ہیں۔ چیز اور بنی بھی چیز ہیں، بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے باعثیچے اور جنگل میں فرق ہوتا ہے۔

عام طور سے بنے بھے گیت محفل کے لیے ہوتے ہیں۔ اکیلے کے لیے نہیں۔

موسیقی اکیلے پر اور اثر رکھتی ہے، محفل پر اور۔ اکیلے میں اندر کا انسان باہر نکلتا ہے۔

نفسیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ انسان اذی طور پر اکیلا ہوتا ہے۔ باہر کا انسان اس اکیلے پن سے خالق ہے اور اس خوف سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے گرد بھیڑ لگائے رکھتا ہے۔ کلدڑ کا سہارا لیتا ہے۔ کلدڑ میں عیوان کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

طفیل کا وہ ٹیپ خانہ ساز ٹیپ تھا۔ اسے کسی نے بنایا سنوارا نہ تھا۔ اس میں نائش کا عنصر نہ تھا۔ طفیل کے اندر کا آدمی گارہا تھا۔ میں اکیلے میں سمجھ رہا تھا۔ میرے اندر کا انسان میرے سامنے آبیٹھا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ میرے انوکھے عشق کی حقیقت سے واقع ہو۔ میرے بے نام محبوب کو جانتا ہو، جس کے باہرے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

طفیل کے ان گیتوں نے مجھ میں تخلیق کی تحریک پیدا کی۔ پانچ سال مسلسل۔ پانچ سال طفیل کے گیت مجھ میں تخلیق کی تحریک پیدا کرتے رہے۔ طفیل میرا حسن بن گیا۔ چند ایک سال کے بعد طفیل راولپنڈی آگیا۔ میں بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگا۔ گردیکھ کر بہت مالیوس ہوا۔

میرے اُد برمودہ طفیل نہیں تھا جو مجھ سے پُچھا کرتا تھا کہ "جل منی دیا باویا"

اس طفیل میں تربپ نہ تھی، پکار نہ تھی، تلمی نہ تھی، دلکھ نہ تھا۔ وہ ایک عام انسان تھا۔ اس میں مٹھاں تھی، عجرا تھا، رواداری تھی۔ میں جیران تھا کہ وہ طفیل کدھر گیا جو ٹیپ میں کراہتا تھا، پکارتا تھا، بین کرتا تھا۔ شخصیت کے تفادات کو میں مانتا ہوں۔ لیکن شخصیت کی بنیادی وحدات کو بھی مانتا ہوں۔

ظاہر تھا کہ طفیل ایک منفرد فنکار ہے۔ اس نے یہ انفرادیت کیسے حاصل کی؟ میرے اندر ایک ٹھوڑا گھنی کا سماں کے اندر دلکھ کے اخہمار کی صلاحیت کیسے پیدا ہوئی۔ یہ فنکار کس دھنی میں ڈال کر دھننا کا گیا کہ رُوان رُوان ہو گیا۔ مجھے طفیل کی زندگی سے دل چپی پیدا ہو گئی۔

طفیل شام چوراسی سے ایک میل دور مذہبیان گاؤں میں پیدا ہوا۔ شام چوراسی پنجاب کا ایک مشورہ معرفت قصیر ہے جو گانگی کے ایک بڑے گھر کی وجہ سے مشورہ ہے۔ ہمارے کئی ایک معرفت گوئی شام چوراسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

مذہبیان سکھوں کا ایک کاڈل تھا جہاں طفیل کا گھرنا مسلمانوں کا واحد گھرنا تھا۔ یہ گھرنا پکھا وچ کا گھرنا تھا۔ طفیل کے آباد احمدادرہ سے بڑے پکھا وچ ہے تھے۔ وہ کھلے ہاتھ کا طبلہ بجانے میں ماہر تھے۔ یہ فن تال کافی ہے اور ان دنوں ایک بڑی قدر و میزالت تھی۔ بالیں سے ہی طفیل کے کان میں سُر اور تال کی آوازیں پڑتی رہیں۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گانے کا گلے سے تعلق ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ بنیادی طور پر گانے کا کان سے تعلق ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم ایک جیسا ہیں سنئے۔ کچھ لوگ زیادہ سنتے ہیں، کچھ کم۔ کچھ لوگوں میں سئی ہوئی چیز کو زیاد داشت میں محفوظ کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں میں کاٹنک بننے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔

جب طفیل بڑا ہوا تو اسے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ سکول کا ہیڈ ماسٹر سر کا

رسیا تھا۔ اسمبلی میں جب اس نے طفیل کو دعایا کرتے ہوئے سنا تو اس کی توجہ طفیل پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اسے گانے کی ترغیب دینے لگا، اور زیادہ وقت اس کا گانا سننے میں صرف کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طفیل کی توجہ پڑھنے کی بجائے گانے کی طرف لگ گئی، اور اس نے گھر نے کے خلاف بخاتر کردی۔ گھروں لے چاہتے تھے کہ وہ پکھا وجیہ بنے، لیکن اس کے سر پر شر کی لگن سوار ہو گئی۔

موسیقی کے دو پلہ ہوتے ہیں: سُرادر تال۔ تال جسم پر اثر کرتی ہے، سُر رُوح پر۔ تال پر بلا ٹھوپلتا ہے۔ سُر چلتا ہے۔ پاؤں چلتے ہیں۔ رقص چلتا ہے۔ سارا جسم چلتا ہے۔ خواہش جاگتی ہے۔ سُر رُوح کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ دُکھ ابھرتا ہے۔ درد جائتا ہے۔ اندر کا انسان باہر نکلتا ہے۔ تنہائی کا تسبُّق جاتا ہے۔ کائنات سے ایک اُن جانا تعلق بیدار ہو جاتا ہے۔ پھر سب کچھ ایک ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ فن کا بنا یا انہیں جاتا۔ بنا بنا یا آتا ہے۔ البتہ قدرت اسے سُر کرنے کے لیے کھن لاءوں پر ڈال دیتی ہے۔

فن کا خود رو ہوتا ہے۔ گئے کا بولٹا نہیں ہوتا۔ وہ ٹیر دھی لکیر ہوتا ہے۔ سیدھا کرد تو ٹوٹ جاتا ہے۔ نپے تُلے راستے پر نہیں چلتا۔ اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ مشور کے جائے گئے سے پچھے ہی طفیل نے اپنا راستہ خود تلاش کرنے کا عزم کر لیا، اور قدرت نے سُر کے اس دیوانے کو سُر کرنے کے لیے رنگارنگ کے مشاہدات کی دھنکی میں ڈال دیا تاکہ دھنک دھنک کر رُوان رُوان ہو جائے۔

گھروں نے طفیل کے تیور دیکھ کر محسوس کیا کہ سارا دھن جا رہا ہے۔ سوچا کہ جلو، آدھا بانٹ دیتے ہیں۔ بچپن کا شوق ہے، اسے پُورا کر دو۔ شاید کچھ دیر کے بعد سمجھ آجائے اور پکھا وجیہ دا پس گھرا جائے۔ گھر میں طفیل کی بڑی یحییت تھی۔ اس لیے کہ چار ایک بھائیوں کے گھروں میں صرف ایک نزینہ اولاد تھی۔ اس لیے وہ سب کا پیارا تھا۔
لا ڈلا تھا۔

سب نے مل کر مشورہ کیا اور طفیل کو امر تسرکے قریب پہنچا دل کے گردوارے میں نظر کردا رہا۔ دہان طفیل کے نام اربابی کی حیثیت سے ملائیت کر رہے تھے۔ پہنچ گردوارے میں طفیل کا کام گورنمنٹ کی بانی کے بھجن میں شرکت کرنا تھا۔ گردوارے میں دھرپرہجی کایا جاتا تھا، جس کے ساتھ کھلے ہاتھ کا طبلہ بھاتا تھا۔ یعنی پکھا دبھی کی دلپی کی صورت موجود تھی۔ دھرپرہنگیت کی پرانی شکل ہے جو آج کل کی مردجمہ شکل خیال سے مختلف ہے۔

دھرپرہ میں دھنیں بندھی ٹکی ہوتی ہیں اور گاہک کو اختیار نہیں ہوتا کہ روپوبدل کر سکے یا اپنا کمال دکھا سکے۔ دھرپرہ میں زیادہ تر حمد و شنا ہوتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ دھرپرہ ندر کی پیداوار ہے۔ چونکہ دھرپرہ بندش کا صندل کپوزر کر جاتا تھا، اور گانے والے کے لیے اپنے کمال کو پیش کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، اس لیے انہوں نے گاہک میں خیال کی طرز ڈالی جو آج تک رائج ہے۔

تین ایک سال طفیل پہنچ کے گردوارے میں ناٹک بانی گاتا رہا۔ پھر اس کا دل اچھا ہو گیا۔ اس پر طفیل کے والداسے گوندوال کی گنوشا لہ میں لے گئے جو ترن تارن کے ترتیب داتھ تھی۔

گوندوال گنوشا لہ میں طفیل کا کام پارٹی کے ساتھ گاؤں گاؤں پھرنا اور گاہک کر گئو رکشا کا پرچار کرنا تھا۔

شاید گوندوال سے بھی طفیل کا دل اچھا ہو جاتا، لیکن دہان اس کے لیے دو خصوصی دل چسپیاں تھیں۔ ایک تو ہر بلب کا چھوٹا میلا اور دوسرا بے بنائے کا تولا نہ تھا۔ رام۔ تقسیم سے پہلے جاننے ہر سال گاؤں کا بہت بڑا کھٹکا کرتا تھا ہندوستان کے طول و عرض سے بڑے بڑے گاؤں اس اکٹھی میں شرکت کیا کرتے تھے، اور اپنے اپنے شاہ پارے پیش کرتے تھے۔ اس اکٹھی کو ہر بلب کا میلا کہا کرتے تھے۔ یہ میلا بڑے

میلے کے نام سے مشہور تھا، اور اس میں زیادہ تر گانک شُدھ راگ کے ہوتے تھے۔
گوندوال میں ایسا ہی میلائگا تھا، پھر ٹپیا نے پر، جسے ہر بُلب کا
چھوٹا میلا کرتے تھے۔

طفیل کے لیے یہ میلا بہت بڑی نعمت تھا۔ کیونکہ اسے بڑے بڑے گوئیں کو
منہنے کا موقع ملا تھا۔ یوں بچپن میں ہی شُدھ راگ اس کے کان میں بیٹھ گیا اور اس کی
گانکی کی بنیاد بن گیا۔

بڑے کا نتھورام الکر گوندوال آیا کرتا تھا۔ وہ کوئی مشہور گانک نہیں تھا اسے
نئی نئی انوکھی دھنیں اور بندشیں کپوز کرنے کا شوق تھا، اور اسے سیلیوں بندشیں یاد
تھیں۔ نتھورام نے طفیل میں کپورزیشن کا احساس اور شوق دلایا۔

گوشالہ پر چار پارٹی نے طفیل میں گاؤں گاؤں گھومنے کا اشتیاق پیدا کیا۔
گوندوال میں طفیل صرف چار سال رہا۔ پھر وہ راس دھاریوں کے ساتھ
شامل ہو گیا۔

راس دھاریے جگہ جگہ گھوم پھر کر گم جمع لگایا کرتے تھے۔ وہ ناٹک بھی کھیلتے تھے
اور قصہ گوئی بھی کرتے تھے۔ ان کافن گانے، بیان اور ناٹک کا عجیب مگر دل چپ
ملغوب تھا۔

طفیل نے چند ایک برس ان سے ناٹک اور قصہ خوانی کا فن سیکھا، اور پھر
انھیں چھوڑ کر نوٹکی میں شامل ہو گیا۔ نوٹکی گھومتا پھرتا تھیڑا تھا۔

نوٹکی میں طفیل نے سنتی پنلوں، ہیر را بخوا، سوہنی جینوں، پورن بھگت میں
ہیرہ کا پارٹ ادا کیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے تھیڑ کی بندشوں سے
واثقیت حاصل کی۔

اس زمانے میں تھیڑ کی بڑی دھوم تھی۔ تھیڑ کی دُنیا میں آغا حشر کا ڈنکا بجتا تھا۔

آغا حسٹر بڑھی قابلیت اور صلاحیتوں کا شخص تھا۔ وہ ڈرامانگار تھا، شاعر تھا، ڈائرکٹر تھا، کمپوزر تھا اور اداکار تھا۔ اس نے تھیٹر کی بیسیوں دھنیں کمپوزر کی تھیں۔

زندگی میں طفیل نے ڈراما اور تھیٹر کمپوزریشن میں ہمارت حاصل کی۔ آج تک وہ دوسروں کی پارٹیوں میں کام کرتا رہا تھا، چھر فونٹے“ اس میں ذاتی سہرت کی آرزو جائی گی اور اس نے زندگی کو چھوڑ کر اپنی سنگیت پارٹی بنالی۔

آدارگی کے اس دور میں سر کے جنگل میں یہ بھونزا بھول بھول پڑیا۔ کاشٹے کا نئے سے لہو لہاں ہوا۔ مندر میں بھجن گائے، گوشادہ میں گور کھشنا کے گیت گائے، گردوارے میں دھرپدالا۔ کیرن کیا، راس دھاریوں کے ساتھ رام لیلا کھیل، تھہر خوانی میں سر اور بیان کی سنگت سیکھی، زندگی میں عظیم عاشقوں کے کردار پیتے، اور ناٹک کی بندشتوں میں دسترس حاصل کی۔ چھرنگیت توں میں لوک سنگیت سے پریم رچایا۔ یوں سنگیت کی بھول بھیتوں میں بادیہ پہنائی سے طفیل کو سر توں لگی، مکار بھی حاصل ہو گئی، لیکن ابھی درد کو جان بنانا باتی تھا۔ موسيقار تشریف تکمیل تھا۔

سنگیت پارٹی قائم کرنے کا ایک فائدہ تو ہوا کہ چند ایک ہی برس میں سائے علاقے میں طفیل کا نام مشہور ہو گیا اور اس کی پارٹی کی مانگ پیدا ہو گئی۔ لیکن انہیں دلذل قیام پاکستان عمل میں آگیا اور طفیل کو اس علاقے کو چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینی پڑی۔

پاکستان میں اسے ملٹان لے جایا گیا۔ وہ علاقہ نہ رہا۔ عزیز دا قارب نہ رہے۔ پہنچانے نہ رہے۔ وہ ایک بیگانے شہر میں اجنبی کی حیثیت سے آپڑا۔

جوں لوں کر کے اسے سرچھپانے کے لیے ایک مکان تولی گی، لیکن گزارے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر نجی ہو کر اس نے ملٹان میں حلوائی کی دکان کھوولی، اور دُودھ دہی اور مٹھائی بیج کر گزارہ کرنے لگا۔

چندایک ماہ بعد ملتان کا ایک پولسیں افسر طفیل کی دکان پر آتکلا۔ وہ طفیل کا پڑانا فین تھا۔ اس نے طفیل کو سچاپاں لیا۔ بولا "طفیل، دکان داری کر رہے ہو؟ نہیں یہ نہیں ہو گا۔ بھئی، اپنا کام کیوں نہیں کرتے ہے؟" طفیل نے کہا "اپنا کام کیسے کر دیں؟ نہ ساز رہے ہے، نہ ساختی۔" پولسیں افسر نے مال خانے سے اسے ساز خلا دادیے اور اس نے گھوم پھر کچھ راحتی تلاش کر لیے۔ اس کے بعد پولسیں افسر نے ایک سنگیت عفل کا انتظام کیا اور طفیل کو شرک کے لوگوں سے ممتاز کرایا۔ یوں طفیل کی سنگیت پارٹی پھر سے دبودھ میں آگئی اور ملتان کے گرد و نواحی میں اس کی شہرت پھیلنے لگی۔

ایک دفعہ ہی نے تفریح گاہ طفیل سے پوچھا کہ بصیری، تم نے سنگیت کی بہت سی معملوں میں شرکت کی ہے۔ کیا کوئی ایسی محفل بھی تھی جسے تم ناقابلِ فراموش سمجھتے ہو؟" اس سوال پر طفیل مُسکرا لیا۔ بولا "ہاں، ایک محفل ایسی تھی جسے ہم کبھی بھجوں نہیں سکتے۔" پھر اس نے مجھے اس محفل کی روشنی دیتا۔ کہنے لگا "ایک روز شام کے وقت ایک صاحب آئے کھنے لگے کہ پرسوں ہما سے ہاں ایک تقریب ہے۔ آپ اپنی پارٹی لے آئیں۔ اس نے پیشگی کی جائے ساری رقم مع آمد درفت کرایہ ادا کر دی اور ہمیں جگر کا آتا پتا سمجھا دیا۔ یہ جگہ شر سے بچیں تیس میل دُور تھی۔ مقربہ روز ہم اشام کے وقت، دہاں پہنچ کر حیران ہوئے، کیونکہ دیرانے میں ایک بڑے بڑے کے درخت کے قریب ایک بڑا نیمہ لگا ہوا تھا اور خیطے کے باہر دیاں بھی ہوئی تھیں۔ ہم دہاں پہنچے ہی تھے کہ وہ صاحب آگئے۔ اُنھوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور دریوں پر بیٹھا دیا۔

دو گھنٹے کے بعد ہمارے میزبان کے پانچ چھ ساتھی آگئے۔ ان کے آنے پر محفل شروع ہو گئی۔ آدھی رات تک ہم گاتے رہے۔ پھر اُنھوں نے ہم سے کہا کہ کسی وجہ سے برات نہیں آئی۔ اب آپ یہیں آرام کریں۔ صبح دیکھا جائے گا۔ اس پر ہم نے محفل ختم کی اور دہیں دریوں پر بیٹ کر سو گئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہندڑی ہوا چل رہی تھی۔ خوب

نیند آئی۔ صبح جب ہم جا گے تو نہ وہ شامیانہ تھا نہ دریاں تھیں۔ ہم سب نہیں پر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے بڑا کا درخت تھا جس کے قریب ہی ایک کھنڈ رہتا۔ یہ دیکھ کر ہم پر خود طاری ہو گیا اور اپنے ساز اٹھا کر دریاں سے بھاگے۔ یعنی طفیل کی مقبولیت اس مخلوق تک بھی جا پہنچی تھی جو کھنڈر، بڑا اور دریاں پر میں رہتی ہے۔

بھروسی ہی ایک محفل میں ریڈیو پاکستان کے ایک نمائندے نے طفیل کوٹ نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈیو ٹرانسکرپشن میں طفیل اور اس کی پارٹی تقریباً چھ ماہ تک اپنے گلنے ریکارڈ کرتی رہی۔ اس دوران میں طفیل کو اپنا تھیٹر بنانے کا شوق چرا جایا اور اس نے میاں طفیل تھیٹر قائم کر لیا، جس میں آٹھ لاکھیاں تھیں، دس لڑکے تھے اور دس سازندے تھے۔

کہتے ہیں "لولنگ سٹون گیدز فرماں"۔ یہ کہادت کسی سرمایہ دار نے بنائی ہے، جس کے نزدیک ماس صرف سازو سماں ہے۔ فن کی دُنیا میں ٹھوکریں کھانا از میں ضروری ہوتا ہے اور اگر ٹھوکریں کھاتے کھاتے دل کو ٹھوکر لگ جائے، شیشہ تڑاخ جائے، اندر لڑکے پیدا ہو جائے، تو تمہو کو تکمیل کی صورت پیدا ہو گئی۔

لُوٹ پناہ پیدا نہیں ہوتی۔ لُوٹ نہ ہو تو نے سکیاں نہیں چھکتی۔ لُوٹ ہی سے درد رستا ہے۔ اسیں اس کر انگ انگ میں بھر جاتا ہے۔ اب طفیل کی سیگت کا پہلا درخشم ہو رہا تھا۔ کراہ اور پکار سے نکل کر وہ درد بنتا جا رہا تھا۔ فن تلمی کی جگہ اسے منھاس بخش رہا تھا۔

ریڈیو اور میلے ورثن سے ہوتا ہوا آخر دہ لوک دشے میں پہنچ گیا۔ لوک دردش بھی ایک بھیب دغیری ادارہ ہے۔ ۱۹۷۰ء میں دُنیا کے تمام ملکوں کے سیاستے مل بیٹھے۔ انھوں نے کہا: بھائیو، دُنیا میں جگہ جگہ ایک کچھ اکچھ پیدا ہو گیا ہے، جو جھکڑ کی طرح چلے نکا ہے۔ نوجوانانِ عالم اس کچھ اکچھ سے بُری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

اگر یہ جھکڑا یونہی پہنچار ہے تو ساری دنیا کو گرد و غبار سے بھر دے گا۔ نہ کسی ملک کی موسیقی رہے گی، نہ ناجی رہے گا۔ نہ روایت رہے گی، نہ رسم و رواج رہے گا۔ نہ آرٹ رہے گا، نہ دستکاری رہے گی کبھی ملک کی پہنچان نہ رہے گی۔ اس لیے جھائیو، اپنی اپنی روایات، لکھر، آرٹ، لباس کو محفوظ کرو ورنہ ہمارے تمام لکھر موسیخ داروں بن کر رہ جائیں گے۔ اس پر ۳۲ ملکوں نے اپنے اپنے بان لوک درثے کے ادارے قائم کر لیے، تاکہ اپنے لکھر کو محفوظ کر لیں۔ پاکستان نے بھی لکھر کی وزارت کے تحت لوک درثے کا حکم قائم کر لیا۔

اس کچھرا لکھر نے ہماری موسیقی کا سیاستی ناس کر دیا ہے۔ اس نے ستم کو رد کر دیا ہے، تال کو اپنا لیا ہے۔ تیز اور تیز، اور تیز۔ گانے کو رقص میں بدل دیا ہے۔ اس رقص میں کوئی جمالیاتی حرکت نہیں ہے۔ شدتِ دیوانگی، ہسپیریا، جسم جسم جسم۔ جسم اور شدت کا ایک طوفان۔ جسم کی بوتل سے خواہش کا جن اُبھر رہا ہے۔

لوک درثے میں شمولیت کے بعد طفیل کو ایک راستہ مل گیا، فن میں قیام پیدا ہو گیا اور وہ لوک دھنوں کو شدھ سنگیت میں رنگنے لگا۔

طفیل واحد لوک گاہک ہے جس کی گائی کی مبینا در شدھ راگ ہے۔

طفیل نے مشہور لوک گیت ماہیا پر تحقیق کی۔ ماہیا ایک مقبل عام لوک گیت ہے جو تقریباً ہر علاقے میں مخصوص علاقائی دھن میں گایا جاتا ہے۔ تحقیق کے بعد طفیل نے ماہیا کو دیسیوں لوک دھنوں میں سمجھا، اور کئی ایک کو شدھ راگ میں جوگو دیا۔

شدھ راگ عام کے لیے ناپسندیدہ سی، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شدھ راگ ہی وہ دھارا ہے جس سے سنگیت کا باغیچہ ہر بھرا ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم شدھ راگ سے متاثر نہیں ہوتے۔ دیسے تحقیقت یہ ہے کہ سہر راگ ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے تسلیک کیا گیا ہے، جو صرف جاننے والے پہنچی نہیں بلکہ ان جان پر بھی لازماً اثر کرتا ہے۔ اگر ہم ان جان اس تاثر سے محروم رہتے ہیں تو قصور راگ کا نہیں،

گائیک کا ہے۔

شدھر راگ کے گائیک آپ کے اور میرے لیے نہیں گاتے۔ تاثر پیدا کرنے کے لیے نہیں گاتے۔ وہ اپنا مکال ظاہر کرنے کے لیے گاتے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اگر فن کا رپرمنیاٹ کا عذیبہ طاری ہو جائے تو اس میں تاثر نہیں رہتا۔ اگر گائیک خود تاثر میں بھیگ جائے کہ اسے اپنے مکال کی سُدھ بُدھ نہ رہے، تو پھر تاثر کے چھینٹے اڑتے ہیں اور محفل کو بھگوڑ دیتے ہیں۔

مجھے شدھر راگ گانے والوں سے شکایت ہے کہ وہ میرے لیے نہیں گاتے اور پھر مجھ سے ہی شکایت کرتے ہیں کہ میں گا ناسنا نہیں جانا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں ملاتے۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ جاتا ہوں اور وہ دُور نکل جاتے ہیں۔ پھر مجھے طعنے دیتے ہیں کہ میں ساکت و جامد ہوں۔ لیے حسن ہوں۔

طفیل میں یہ خبی ہے کہ وہ میرے لیے گاتا ہے۔ سُننے والوں میں تاثر پیدا کرنے کے لیے گاتا ہے۔

جائے پناہ سے جائے امتیاز

جن دنوں ہندوستان کے مسلمان قائدِ عظم کی تیادت میں حصولِ پاکستان کے لیے
جدوجہد کر رہے تھے، ان دنوں میں سکرپنڈر انسٹروریٹ میں گھبرا بیٹھا تھا۔
میرے ابتداء گرد سانس دان اور فلسفی بیٹھے تھے۔ برٹش نیڈر سل، آنڈھو، جولین، ہالہین،
فرانڈ، یونگ، ایڈر اشان ہار، نیٹھے۔ یہ سب لوگ مجھے سمجھا رہے تھے۔ زندگی کے مشتعل سانسی
زاویہ نظر سکھا رہے تھے۔

ایک کہتا: شک کرو۔ ہر بات پرشک کرنا سیکھو۔ ایمان سے بچ کرہنا۔ کسی بات
پر ایمان لے آئے تو اس کے برداشت کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ اپنی بن کر بیٹھ جاؤ گے۔
دوسرا کہتا: جذبہ ایک دلدل ہے۔ اس دلدل میں چلنگ کئے تو ڈوب جاؤ گے۔ تیرنا
چاہتے ہو تو فکر کر اپناو۔

تیسرا کہتا: میاں سیکل بنو۔ مذہب تھیں محمد و دکر کے رکھ دے گا۔ دعوت چاہتے
ہو تو لا دینیت اختیار کرو۔

چوتھا کہتا: کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں۔ بے شک اللہ کو مالت۔ اللہ تو تھکے
ہوئے سر کے لیے تکیر ہے۔ اگر اللہ نہ ہوتا تو بھی ہم اپنی تسلی کے لیے اسے ایجاد کر لیتے۔ لیکن
اللہ ایک پرشنل چیز ہے۔ اسے پرشنل ہی رکھو۔

ان کی باتیں سُنْ سُنْ کر مجھے اس بات پر نہ امدت محسوس ہوئی تھی کہ میں مسلمان ہوں۔
اگرچہ میں منہ زبانی مسلمان تھا، خالی، نام کا۔ پھر بھی تھا تو مسلمان۔ جب بھی خیال آتا، شرم سے

میری گردن لئک جاتی تھی۔

دُبَر سے مجھے اپنے بیک درڈ ملن اور فرسودہ روایات پر شرمندی محسوس ہوتی تھی۔
مشتری مفکروں کو درخواست انہیں سمجھتا تھا۔ نکر و نظر سے متسلق تیرا مکہ مغرب تھا۔

آپ سے کہ دوں تو کیا ہرج ہے کہ میرے ذہن میں سیاست کا خانہ جب بھی خالی تھا
اب بھی خالی ہے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہے۔ بلا وجہ میرے دل میں یہ ایمان پختہ ہو چکا ہے کہ
سیاست ہیرا پھیری کا دوسرا نام ہے۔

آب آپ خود ہی سمجھ لیں کہ جو شخص مذہبی جذبے پر نہادت حسوس کرے، ملن سے
بیگار اور سیاست میں کوڑا ہو، تو اُسے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے مطابق سے کیا
ہمدردی ہو سکتی ہے۔

ٹھہر یے! اس سے آپ یہ اندازہ نہ لگا لیجیے گا کہ مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی زبان
حالی اور مظلومیت کا احساس رہتا نہیں، ایسی بات نہیں۔ میں نے اتنا کچھ دیکھا تھا، مجھے اتنا
کچھ دیکھنا پڑا تھا کہ میں نے ڈرکاریوں میں بند کر لی تھیں۔

میں نے سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کی بھرتی روکنے کی سرگرمیاں دیکھی تھیں۔ تجارت
میں مسلمانوں پر درخوازے بندر کرنے کی ہیرا پھریاں دیکھی تھیں۔ چھوٹ چھات کے ذریعے انہیں
اساں مکری میں ڈبوایا جا رہا تھا۔ دست کاری میں ان کی برتری کو ٹھیک میں بن کر لوٹا جا رہا
تھا۔ کاشت کاری میں جماں بن کر قرض کی قیمتی سے کاشا جا رہا تھا۔ سوچنے مجھے دُور رس
منصوبوں سے مسلمانوں کی الگ کو سمجھایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ کہاں ہو رہا تھا؟ اس صورتے
میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔

میں اکثر بیٹھ کر سوچا کرتا: یا اللہ! اگر یہاں یہ حال ہے تو ان علاقوں میں کیا ہو رہا
ہو گا جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

میں یہ سب کچھ جانتا تھا، اس کے باوجود مجھے میں نہیں آتا تھا کہ مسلمان الگ وطن کا

مطالبہ کیوں کر دے ہیں ؟
اس کی دو وجہات تھیں :

پہلی وجہ یہ تھی کہ براۓ نام مسلمان ہونے کے باوجود دیری رکوں میں مسلمانی خون دوڑ رہا تھا۔ اور مسلمان انلی طور پر ایک بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس بیماری کو کہتے ہیں، فراخ دلی۔ اگر تعصیب پائے جی تو وہ سلطی رہتا ہے۔ دل نہیں پہنچ پاتا۔ بدستی سے قومیں کی بقا کے لیے بخوبی اسامیث تعصیب ضروری اوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں: اگر غیر مسلم لوگ چھوٹے دل کے مالک ہیں تو اس کا یہ طلب نہیں کہ ہم بھی اپنے دل کو چھوٹا کر لیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں دانشور تھا اور مذہبی ناوی نظر سے سوچا میرے شایان شان نہ تھا۔ جب بھی مجھے مسلمانوں کی زبوبی حالت کا خیال آتا تو دفعتہ اندر سے دانشور سرز کاتا۔ یہ کیا سوچ رہا ہے تو؟ ایسے چھوٹے خیالات کو دل میں رجاتے ہوئے شرم نہیں آتی تھے؛ مذہبی جذبات کی دل میں پھنسنا چاہتا ہے کیا؟ لا حول ولا قوۃ!

لا حول پر طھوکر میں ان یکینی خیالات کو اپنے ذہن سے چھپ کا رادیتا اور اپنے فکر کو تعصیب کی آلات سے پاک کر دیتا۔ پھر خود کو ایسے خیالات سے محفوظ کرنے کے لیے سوچتا ہے: پاکستان کے مطالبے کا مقصد جانا ہے تو؟ وہ پاکستان جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، اہو گا کیا؟ مذہبی جذبے سے گلا سڑا ہوا ایک ملک جس میں بندشیں ہی بندشیں ہوں گی۔ شلوار کی تھری چار اپنی سے نیادہ نہ ہو۔ ڈاڑھی کی لمبائی ایک مٹھ سے کم نہ ہو۔ سرزگانہ ہو۔ پاجا مہ طخنوں سے اوچا ہو۔ گانے بجائے پرپرہ ہو گا۔ ناچنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ادب پر اسلامی شتری کھڑا ہو گا۔ پنڈت اور بیٹت تراشی سخت سزا کی مستوجب ہو گی۔ فلموں میں مکالمات کی جگہ آیات ہوں گی۔ اس پاکستان کے لیے ہمدردی کے جذبات رجاۓ گا کیا؟ لا حول ولا قوۃ۔

قائدِ اعظم کے کردار سے میں بے حد متاثر تھا۔ اس کی وجہ نامبا یہ تھی کہ ان کے بذریں دشمن بھی ان کے کردار کے مصیر تھے۔ کبھی کسی کو جراحت نہ ہوئی تھی کہ قائد کے کردار پر

حرفت زنی کرے۔

قائد کی ذہن میں عزت کیوں نہ ہوتی۔ ان میں ہر دہ بات موجود تھی جس کا میں حرفت تھا۔
حدید علم سے آکارستہ تھے۔ اصولوں کے پابند تھے۔ ہیرا پھری نہ خود کرتے تھے، نہ درودوں کو کرنے
دیتے۔ عقل و خرد کے قائل تھے۔ جذبات سے مروع نہ ہوتے تھے۔

مجھے قائدِ عظم سے صرف ایک شکایت تھی۔ سوچتا: قائد نے سیاست کو کیوں اپنا رکھا
ہے؟ اگر ہیرا پھری کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تو ہیرا پھری کے اکھاڑے میں کیوں آکھڑے
ہوئے ہیں؟

بڑے بڑے سیاسی اقدام کا تو مجھے شعور نہ تھا، البتہ چھوٹی چھوٹی بالوں پر میں اکثر سوچا
کرتا تھا۔ مثلاً گاندھی جی اپنے آپ کو جمانتا کہلوتے تھے۔ ہم سب انھیں جمانتا کرتے تھے اخباروں
میں بھی ان کا نام جمانتا گاندھی چھپتا تھا۔ لیکن قائدِ عظم انھیں ہمیشہ سوچ رکاندھی کہ کرم بلاتے تھے۔
بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر قائد انھیں جمانتا کہ کرم بلانے سے کیوں گریز کرتے تھے؟ اتنی
چھوٹی سی بات پر کیوں مند کرتے ہیں؟ جمانتا ان کے نام کا جزو بن چکا تھا۔ بچرا انھیں جمانتا
کرنے میں کیا حرج تھا؟

یہ نہیں کہ مجھے جمانتا کے مفہوم کا علم نہ تھا۔ میں اچھی طرح سے جمانتا کو جمانتا کا
مطلوب علم انسان ہے۔ لیکن مجھے حقیقت کا شعور نہ تھا کہ اگر آپ کسی کو بار بار عظیم انسان کہ کر
بلائیں تو ان جانے میں آپ اسے عظیم انسان مانتے لگیں گے۔ اور اگر آپ کسی کو عظیم انسان مان
لیں تو پھر اس کی بات کو رد کرنا مشکل ہو جائے گا۔

بھرپور سلام کرنے کی تفصیل تھی۔ جمانتا گاندھی جب بھی قائد سے ملتے تو دونوں ہاتھ
بڑکر رکھتے پر سے جاتے اور بھر جھک کر انھیں منسکار کرتے۔ اس کے بعد عکس قائد رسی اخلاق
سے ٹوپی کو چھوڑتے اور ایک خشک اور کدرہ لگڑہ مارنگ کر کر منسکار کا جواب دے دیتے۔
بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ قائدِ عیسیٰ مسلم لیدر دل سے بھیگ کر کیوں نہیں تھے؟

پھر بس کی بات تھی۔ کانگریسی لیڈر قومی بس پہنچتے تھے۔ لیکن قائدِ عظم مغربی بس پہنچنے کے قابل تھے۔ اور صرف یہی نہیں کہ مغربی بس پہنچتے تھے بلکہ ان کے بس سے ہاؤس آف لارڈز کی بُداشتی تھی۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ شاید اسی یہے روز نامہ ”ٹریبیون“ ان باقول کہ بہت اچھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل میں قائدِ عظم کی عزت تھی۔ پھر قیامِ پاکستان کی بات بکھر گئی۔

اس پرلاہور میں ایک قیامت خیز طوفان چل پڑا۔ اس روز شام کا وقت تھا۔ احمد بشیر اور میں دونوں کسی کام سے جا رہے تھے۔ مال روڈ کے فٹ پاٹھ پر مولانا صلاح الدین احمد مل گئے۔ علیک سلیک کے بعد کوئی بات چلنکی ممکن ایک سورا تھا۔ اس سور کی نوعیت تشدید جبری تھی۔

دیکھا تو ایک جانب سے نگلی کر پاؤں کا جلوس آرہا ہے، اور پاکستان مُردہ باد کے نفرے لگ رہے ہیں۔ یہ جلوس بہت لمبا تھا اور اس میں سے تشدید کے بھیکے اٹھ رہے تھے۔ ساری مال روڈ ستمگی۔ ابھی یہ جلوس ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک گلی سے عورتوں کا جلوس برآمد ہو گیا۔ وہ سب بھاگ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پاکستان کا سیاپاکرہ تھی تھیں۔

دفعۃ مولانا صلاح الدین چونکے۔ ارے صاحب! وہ لبرے یہ جلوس تو ایک دھمکی ہے۔ فضائے تیور ٹھیک نہیں۔ میں چلتا ہوں؟
”وہ کیوں؟“ احمد بشیر نے پوچھا۔

”صاحب، میرا مکان تو شُرُدہ ہندو محلے کے عین درست میں ہے۔ اللہ خیر کرے۔“
محیٰ گھروالوں کی خبر لینی ہے۔“

ان دونوں احمد بشیر اور کے اس حصتے میں تھا جسے گرین یو تھا کہتے ہیں۔ وہ ڈر کے مفہوم سے وابقت نہ تھا۔ اس کی دلیری حماقت کی حد تک پہنچی تھی۔ جلوس کو دیکھ کر وہ بہت خوش

تحا شاید اس یے کہ اس کی نظر میں وہ جلوں آنے والے ایسے بخرا کا پیام بر تھا۔
احمد بشیر میری طرح منہ نبافی مسلمان تھا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ اس کے دل میں ایک اندازا
اسلامی جذبہ موجود تھا۔

مولانا صلاح الدین کے جانے کے بعد احمد بشیر لولا "یار، تیری ہمشیرہ بھی کرشنگریں رہتی
ہے۔ چلو، اسے دہان سے نکال لائیں" ॥

جب ہم کرشنگر پہنچے تو جوک میں ایک تانگے کے ارد گرد پھر لگی ہوئی تھی۔ کوچوان
کی لاش زمین پر پڑی تھی اور ایک مفترہندی چلا چلا کر کر رہی تھی "ظالمو! یہ تم نے کیا کر دیا! اس
نے تو مجھے ماں کما تھا: ماتا جی، آپ میرے تانگے پر پلٹھ جائیں۔ میں آپ کو خیریت سے کرشنگر
پہنچا دوں گا۔ یہ تم نے کیا کر دیا؟ اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا!

تلنگے کے ارد گرد بیس پیس جوان کھڑے تھے جن سے دہ مخاطب تھی۔

پھر احمد بشیر نے ایک کڑکا ہڑا نزہہ مارا "اللہ اکبر!" دہ سب ستم کر پہنچے ہٹ گئے
اور احمد بشیر میری ہمشیرہ کے گھر جادا خل ہوا۔

ہمشیرہ کو کرشنگر سے نکالنے کے بعد میرے ذہن میں ایک نیا سوال اُبھرا کر یہ لوگ
پاکستان کے قیام کے خلاف ہیں تو بے شک ہوں لیکن تواریں لہراتے، سیاپا کرنے اور خنجھل لانے
کا مطلب؟ سیدھی بات ہے مسلمانوں کو سمجھا کر پاکستان کا قیام ٹھیک نہیں۔ اس طرح مک
بٹ جائے گا۔ اس پر بھی اگر وہ نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ بنایئے دو پاکستان۔ یہ لڑائی بھجوگا کیوں؟
پھر یہ بھی ہے کہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ تو ایک بیشتر مانگ ہے اور "نہیں بننے دیں گے"
ایک منفی بات ہے۔ اور کوئی سمجھو دا۔ آدمی منفی مانگ سے ہمدردی نہیں رکھ سکتا۔

پھر حماقت کی انتہا دیکھو کہ یہ لوگ مسلمانوں کے اکثریت کے علاقے میں پھرے بازی کی
رم ڈال رہے ہیں۔ اگر مسلمان متعلق ہو گئے تو کیا ہوگا؟ اتنی سی بات نہیں سمجھتے یہ مذاہی دیلنے۔
لیکن ان کے لیڈر تو کہتے ہیں اہم سیکلر ہیں۔ دہ انھیں سمجھاتے کیوں نہیں؟

بھرال، لاہور میں تشدد کے دفعات ہوتے رہے کبھی بھائی دروازے کے سینا ہاؤس میں بم چھپت جاتا، کبھی رات کے اندر ہرے میں مسلمان محلے میں بم چینکے جاتے، کبھی ہندوؤں کے محتوں سے مسلمانوں کی چھڑا زدہ لاشیں برآمد ہوتیں۔ ان دفعات کے ساتھ ساتھ میرے فکر کا لُخ بدلتا گیا۔

پھر ۱۹۳۴ء کی ابتداء میں احمد بشیر اور میں فلم سازی کے لیے بمبئی پلے گئے۔ وہاں کرشن ہنڈر نے اپنے گھر "کورڈ لاج" میں ادبیوں اور فن کاروں کے لیے مفت کی سرائے کھول رکھی تھی۔ ہم نے بھی ایک کمرے میں بستر لگائے۔ اس کمرے میں میراجی پلے سے براجان تھا۔

بمبئی میں ان دنوں چھرا بانی نزروں پر تھی۔ دقت یہ تھی کہ احمد بشیر اور میرا حکیم نیم مسلمانوں کا ساتھا۔ مگر میراجی کی میاں اپ ہندو جو گیوں سی تھی۔ اگر ہم مسلمان علاقے میں گھوستے تو تیرمیراجی کا ننگ بہنی کی طرح زرد ہو جاتا، اور وہ مفتر محترکا پہنچنے لگتا۔ ہندو علاقے میں گھوستے تو میری جان عذاب میں رہتی۔

احمد بشیر کے ذہن میں ڈر اور احتیاط کے خانے خالی تھے۔ اٹھا میں تو یہ شوق تھا کہ کتنی چھڑا لے کر اس پر پکے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان علاقے میں کوئی فرق نہ تھا۔ میری اپنی یہ کیفیت تھی کہ میں سوچتا تھا: اگر کوئی چھڑا لے کر مجھ پر لپکا تو میں کہوں گا "ابے او رُک جا" وہ رُک جائے گا۔ چھر میں کہوں گا "جگہ پتا نہیں کیا، میں تو ایک سیکل آدمی ہوں" میں قونام کا مسلمان ہوں۔ مجھ پر حملہ کرتا ہے، احمد؟ چھڑا یک روز حملہ ہو گیا۔

ہُوا یوں کہ اُس روز میں احمد بشیر نے چھڑا گیا۔ دادر کے علاقے سے گزر رہا تھا پہنچتا کم تھا، ادھر ادھر دیکھتا زیادہ تھا۔ چھڑا یک اور راہ گیرا گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ شاید وہ بھی میری طرح خافت تھا۔

دفعہ گلی سے ایک چھرے بازنگلا اور میرے ساتھی کی طرف پکا۔ میرا ساتھی بہت

چلایا۔ نہیں، نہیں۔ میں نہیں۔ لیکن حملہ آور نے اس کی بات سنبھلیتے ہیز سے ڈھیر کر دیا۔ میں درکر بھاگا۔

اس پر میں سوچنے لگا کہ یہ چھرے والے تو بات ہی نہیں سنتے۔ پوچھتے ہی نہیں کہ میاں تم کیسے مسلمان ہو۔

گھر پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ چاہے میں سیکھ رہتا، چاہے داش و رہتا، چاہے نام کا تھا بہر صورت میں مسلمان رہتا۔ اس روز میں نے پتھے دل سے تسلیم کر دیا کہ میں مسلمان ہوں، اور پاکستان میری واحد جائے پناہ ہے۔ اس کے بعد مجھے میں سے میرا دل اچھا ہو گیا۔

بمبئی میں ہمیں بہت سا کام ملنے کی صورتیں پیدا ہو چکی تھیں، ہزاروں روپیں کے کانٹریکٹ حاصل کرنے کی امیدیں بن چکی تھیں۔ بلکہ ہم دونوں امارت اور عیاشی کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ بمبئی کی امارت میری نظر میں یعنی ہو کر رہ گئی۔ اس لیے ہم بمبئی پھوڑ کر لاہور آگئے۔

ہمارے لاہور پہنچتے ہی راستے بند ہو گئے۔ گشت دخون کا بازار گرم ہو گیا۔ یہ قسم ہو گئی اور مشرقی پنجاب کی سر زمین مسلمانوں کے خون سے مُرخ ہو گئی۔

میں نے لاہور کے ریونجی کمپسون میں زندہ لاشوں کے ڈھیر دیکھے۔ اپنے عزیز دو اقارب کو ضلع گورداپور سے پاکستان لاٹ کیلیے میں خود دہاں گیا۔ دہاں کے خونی مناظر دیکھ کر میری روح میں ایک دراڑ پڑ گئی، جس میں سے ساری کی ساری دانشواری چو گئی۔ سیکل ازم کا بھوڑا پھٹ اگیا اور میں مسلمان ہو گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرنے لگا۔ مجھے شدت سے احساس ہو گیا کہ پاکستان میرے لیے واحد پناہ گاہ ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اگرچہ میرا زادیہ نظر تبدیل گیا، یعنی ایک توہین پاکستان کو اپنی واحد پناہ گاہ سمجھنے لگا، دوسرے میرے دل میں مسلمانوں کے لیے ایک جذبہ پیدا ہو گیا۔ چھوٹی میں اسلام سے کوہا ہی رہا، اور میرے دل میں اپنے اللہ کے لیے شکرگزاری کے سوا اور کوئی جذبہ نہ اچھا۔

میں نے اپنا مطالعہ نفیات سے شروع کیا تھا، پھر میں جس میں جا پہنچا، اور وہاں سے

EXTRA SENSORY PERCEPTION

چلتے پار اسائیکالوجی میں جانکلا۔ ای ایس پی یعنی

کام طالع مریرے یہے حیران کن محتوا۔ یوں کچھ یجھے کہ سائیکلک سنس میں پہنچنے کے لیے مجھے عقل دخود کا بیرونی پارکن پڑا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہواں جہاں سا مڈیمیرر کو توڑتے ہیں۔

ای ایس پی دراصل ایک چھٹی جس کا نام ہے۔ یہ چھٹی جس قدرت کی طوف سے تختہ بھی طقی ہے اور ریاضت سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے چھٹی جس کی لوہ میں چلتے چلتے میں بتت جا پہنچا۔ بتت سے متلفہ کتابوں کے نظر سے ظاہر ہوا کہ وہاں یہ جس مقابلہ عام ہے، اور وہاں کے پادری تیسری آنکھ گھوٹنے کے لیے باقاعدہ تربیت دیتے ہیں۔ پھر میری یہ جسجو بھکشوؤں جو گیوں، صوفیوں اور بزرگوں تک جا پہنچی۔

یہ جسجو تو اپنی جگہ قائم تھی، لیکن قیام پاکستان کے بعد قائدِ اعظم کے لیے جنہیں مشکر گزاری میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے میں قائدِ اعظم کی زندگی کے حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔

قائدِ اعظم کی شخصیت میرے لیے ایک ممتاز تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ پڑھا لکھا قابوں میں

جو سیکلر زادی نظر کا حامل تھا، اسے ایک اسلامی حملہ بنانے کا اعزاز حاصل ہو گیا!

جناب اشرف علی تھانوی صاحب سے تعلق ایک کتاب پڑھتے پڑھتے دفعہ میں چڑکا۔ کھا تھا :

مولانا شبیر علی فرماتے ہیں :

مئی ۱۹۴۷ء میں ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اشرف ملی تھانوی سر جھکٹے منظر بیٹھے تھے۔ دفعہ اخنوں نے سر اٹھایا۔ فرمائے گئے : میاں شبیر علی، ہوا کا رُخ بتا رہا ہے کہ لیگ کا سیاہ ہو گی۔

(تعمیر پاکستان اور علمائے رہنمائی — صفحہ ۶۹)

اسے ! میں چڑکا۔ اُس وقت جملہ کون سی ہوا پہل رہی تھی، جس سے مولانا نے اندازہ

لکھا یا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آئے گا۔ ابھی تو لاہور دریہ رویشن بھی پاس نہ ہوا تھا۔

مجھے مولانا کے کشف پر حیرت نہ ہوئی تھی چونکہ میں کشف کو چند لال اہمیت نہیں دیتا۔ مولانا خود کشف دکرامات کو فروعات کے ذمہ میں گنتے ہیں۔ مجھے حیرت اس لیے ہوئی کہ قائدِ اعظم اور تائید ایزدی کا ربط مل گیا۔

مولانا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

جو سلطنت ملے گی (پاکستان) وہ انہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب نامت و ناجبر کھتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ مل جھی جائے تو ان کے بیس کاروگ نہیں۔ کیونکہ سلطنت کرنا دنیا طاروں کا کام ہے۔ ہم سلطنت کے طالب نہیں، صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو دہ دینیں اور دیانت دار لوگوں کے براختر میں ہو۔

اس پر مولانا نے طے کیا کہ قائدِ اعظم سے رابطہ پیدا کیا جائے، اور انہیں دین کی تعلیم دی جائے۔ حیرت اس بات پر ہوتی کہ مولانا، جو مانے ہوئے عالم اور مجددِ دین تھے، انھوں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔ کیونکہ سلطنتوں کے معاملات میں دخل دینا یزدگوں کا کام نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک ایسی حملکت کی بہتری اور بسود کے بارے میں عملی طور پر ت Edmund Allen کا فیصلہ کیوں کیا۔ جسے دس سال بعد وجود میں آتا تھا، اور جس کے سر بناہ ہونے کا اعزازِ محمد علی جناح کو نصیب ہونا تھا، اس قسم کی دخل اندازی بزرگوں کا مسلک نہیں۔

مجھے خیال آیا، کیا مولانا اشرف علی تھانوی کو حکم لاتھا کہ ایسا کریں؟ اگر ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ قیام پاکستان کو تائید ایزدی حاصل تھی۔

خیر، مولانا اشرف علی تھانوی نے باقاعدہ طور پر دقوں کے بعد علمکے وفد قائدِ اعظم کے پاس پہنچنے شروع کر دیے اور یہ سلسلہ کافی دریک جاری رہا۔

حیرت کی بات ہے کہ قائدِ اعظم نے تبلیغ کے اس سلسلے کو کیسے قبول کر دیا۔ بے شک قائدِ اعظم مسلمانوں کے لیے ایک الگ دلن کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن ان کی جدوجہدِ مسلم شیفڑ

کے لیے تھی، اسلامی حملہ کے لیے نہیں۔
ان کے نزدیک مذہب اور سٹیٹ دو اگ چیزوں تھیں۔ وہ سٹیٹ کو مذہب کے
تابع نہیں سمجھتے تھے۔

بے شک قائد نے علماء کے وفد کی باتوں کو غور سے مُنا ہو گا۔ کیونکہ وہ دوسروں کی
بات تو جو سے منتنے کے عادی تھے۔ لیکن قائل ہوئے بغیر وہ دوسروں کی باتیں مانتے نہیں تھے۔
پھر انہوں نے وفد کی باتیں کیسے مان لیں؟

حیرت کی بات ہے کہ علماء کے اس وفد سے دو ایک ملقاتوں میں قائد کے بنیادی
عقائد ہی بدلتے۔ (رمضانی ادب تبلیغ۔ صفحہ ۹۶) فروردی ۱۹۳۹ء کو دہلی میں وفد سے ملاقات کے
بعد انہوں نے فرمایا ”میری بھروسے اب خوب آگیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب کے تابع
ہوتی ہے۔“

پھر مولانا اشرف تھانوی کے مکتوب کے جواب میں قائد نے لکھا ”آپ کی ہدایات پر
عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ آئندہ بھی آپ مجھے ہدایات فرماتے رہیں۔“ رفادات اشرفیہ در
مسائل سیاسیہ۔ صفحہ ۹۶۔

قائد کی مولانا سے عقیدت اس حد تک پہنچی کہ انہوں نے بمبئی کے تاجران کے جلسے میں
کہا : (تعیر پاکستان اور علمائے رباني۔ صفحہ ۹۶) ”مسلم لیگ کے پیچے ایک بہت بڑا عالم ہے۔
اگر ان کا علم، تقدس اور تقویٰ ایک پلٹرے میں رکھا جائے اور دوسرے پلٹرے میں باقی سب علماء
کا تو ان کا پلٹر ابھاری رہے گا۔ دہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔“

مولانا نے کیا جادو کر دیا کہ قائد کا زادیہ فکر ہی بدلتا گیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس دوران
میں قائد کی داخلی زندگی میں صدر کوئی انقلاب آیا ہو گا۔

مولانا کی طرف سے اس حد تک دھل اندازی اور فائزہ میں اس حد تک قبولیت ہایہ
دولوں باتیں اس کی شہد ہیں کہ کوئی تیسرا طاقت کام کر رہی تھی۔ یعنی تائید ایزدی علی طور پر

راستہ ہمار کر رہی تھی ۔

ان حقائیں کو جاننے کے بعد میری توجہ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرشد جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی طرف مبذول ہو گئی۔ (حیات امداد) صفحہ ۶۱ ۔

حاجی صاحب کی ذندگی کے کوئی پڑھنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہندوستان میں پہلی اسلامی حملہت انہوں نے خدا قائم کی تھی، وہ خود اس کے سربراہ تھے اور انہوں نے اعلان کیا تھا کہ اس حملہت میں تمام قوانین اسلامی شریعت کے مطابق ہوں گے۔

یہ ریاست تھا نہ بھون کے علاقے میں، ۱۸۵۷ء میں قائم کی گئی تھی جس کے باعثے میں

حضرت مولانا حسین احمد صاحب لکھتے ہیں :

اعلان کر دیا گیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا۔ حضرت مولانا شید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو سپر سالارِ فوج قرار دیا گیا۔ حضرت حافظ امان صاحب تھانوی کو میمند اور میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔

یہ سب بزرگانِ دین جماد کے لیے تھا نہ بھون جمع ہوئے تھے اور انہوں نے بڑی سمجھی گئی سے اس اسلامی ریاست کی تنظیم کی تھی۔ یہاں تک کہ اسلامی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے باقاعدہ طور پر شامی کی تحصیل پر عملہ کیا تھا۔

اگرچہ یہ ریاست دیر پا ثابت نہ ہوئی کیونکہ انگریز دل نے دربارہ منظم ہو کر حملہ کیا اور قلعہ کر لیا۔ پھر بھی یہ واقعہ عجیب ترین واقعہ ہے۔ اس لیے کہ بزرگانِ دین نے کبھی ریاست قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ریاست قائم کرنا ان کا مسلک نہیں۔ پھر یہ ریاست کیوں قائم کی گئی؟

بیان کیا جاتا ہے کہ انی دلوں جب انگریز حاکموں نے عوام کے سامنے تذمیل کرنے کی نیت سے جناب حاجی امداد اللہ صاحب کے لامپ باندھ کر ان کا جلوس نکلا تو مجھ سے ایک مست آگے بڑھا اور جناب حاجی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا :

یہ سمجھیو کہ تیری محنت اکا رست گئی۔ جو زیج تونے بجایا ہے، نو تے سال کے بعد اس میں سے پورا پھر ملے گا۔

ان حقائق سے ایک بات واضح طور پر اخذہ ہوتی ہے کہ قیامِ پاکستان کو تائید ایزدی حاصل تھی۔ مجھے یقین ہے کہ قائدِ اعظم کو اس امر کا شور تھا۔ لازماً ان کی زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر ایسے واقعات یا مشاہدات ہوتے ہوں گے جن کی وجہ سے انھوں نے بزرگان دین سے رابطہ قبول کیا اور ان کی تلقین سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا اندازِ فکر ہی بدلت دیا۔

ان انکشافات کے بعد میرے ذہن میں باہر باری خیال پیدا ہوتا کہ پاکستان کو کیا خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے لیے اس قدر اہتمام کیا گیا؟

پاکستان ایک چھوٹی سی غریب مملکت ہے۔ بے شک اہلِ پاکستان میں اللہ محمدؐ اور قرآن پاک کے لیے گھر ایڈب موجود ہے، لیکن نہ تو ہماری زندگی اسلامی زندگی میں رنگی ہے نہ فکر۔ اور اسلامی کردار کا تو ہمیں شورہ ہی نہیں۔ اُنہاں ہماری خصلت میں ہر دہ عیوب موجود ہے جو اسلام میں منور ہے۔

اس کے علاوہ یہ کوئی دادِ اسلامی مملکت نہیں۔ دُنیا میں ہمیوں اسلامی مملکتیں موجود ہیں جن میں پیشتر ہم سے پورا جا بہتر ہیں۔ بھر پاکستان پر یہ خصوصی نظر کرم کیوں؟ — بات سمجھیں نہیں آتی تھی۔

پھر میری تیناتی راولپنڈی میں ہو گئی، جہاں میری ملاقاتِ عزیز نلک اور یوسف ظفر سے ہوئی۔ عزیز نلک ایک جانے پہنچانے ادیب ہیں، ساتھ ہی وہ عالمِ دین بھی ہیں اور زندگی بھر بزرگوں کے آستانوں پر حاضری دیتے رہے ہیں۔

میں نے ان سے بات کی تودہ مسکرا دیے۔ بسوئے میرے مشاہدے کے طبق بزرگوں کا ایک خاص گروہ پاکستان کے قیام اس کی بغا اور بسود پر مامور ہے۔

عزیز نلک کی اس بات نے مجھے از سرِ نوحیرت میں ڈال دیا۔ میں اپنی طرح جانتا تھا کہ

عزمیں ملک عادتاً نہ تو بھجت جلتے ہیں، دن غلو کو کام میں لاتے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے ان کی بات پر یقین رہا۔

پھر عزیز ملک نے مجھے جانب سائیں اللہ بخش سے متعارف کرایا۔ سائیں اللہ بخش صاحب کامراز مریڑ کے قبرستان میں واقع ہے۔ نہ تو وہاں کوئی گنبد ہے نہ گنڈی ہے۔ نہ مستوی ہے نہ پیر خانہ ہے۔

سائیں صاحب کے تذکرے "مردِ قلندر" کو پڑھ کر مجھے علم ہوا کہ آپ زندگی ہجرہ ایسا اسلامی مملکت کے قیام کے لیے دوسرا بزرگوں سے جو کمی لڑائیں لڑتے رہے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں آپ نے "صدائے درویش" کے عزان سے ایک لٹا بچپن کو کے شاہد کن کو بھیجا، جس میں اخوند نے شاہ کو اسلام کا جھنڈا سر بلند کرنے کی دعوت دی۔ کچھ دیر بعد شاہد کن نے اپنے کمانڈر اعلیٰ العوروں کو سائیں جی کی خدمت میں بھیجا۔ بندھو ہرے میں دونوں کے مذاکرات ہوتے۔

صدائے درویش کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردِ قلندر نے نظامِ دکن کو دعوتِ جہاد دی تھی اور ایک اسلامی سلطنت بنانے کی اپیل کی تھی۔ مثلاً "صدائے درویش" میں سائیں جی کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

تاج شاہی زیبِ سر ہو، ہند کے دُدھا بُنُو
عرب سے عمُم تک آؤں مبارک بادیاں
بنل میں قرآن ہو لپنے دست ہو جید کی تیخ
ان کے حاتم دین احمد ہے سماں سے شاہ دکن

سائیں جی اُتی تھے لیکن جب بھی کیفیت کا عالم ہوتا تو وہ شعر کہا کرتے تھے۔ ان اشعار میں دزن، قافیہ، رولیٹ کم ہوتے تھے۔ نفسِ غمون یا انہمار کیفیت زیادہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے نظام نے سماں رہ دیا۔

سائیں جی کی خواہش تھی کہ ہند میں اسلامی مملکت کا قیام ہو۔ کوئی ایسا مسلمان

مل جائے جو اس قیام کے لیے سما را دے تو وہ اسے ہند کا دُولھا بنا دیں۔

شرط صرف ایک تھی کہ اس مملکت کے ہاتھ میں دینِ محمدؐ کی تیخ ہوا اور بیل میں قرآن ہو۔

آخر یہ سعادت فائدہ عظیم کو نصیب ہوئی۔ قیام تو ہو گیا لیکن ان کی زندگی نے دنماں کی اور وہ دین کے لیے جہاد کی شرط پوری نہ کر سکے۔

قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے دوران بہت سے بزرگ مصلح اور بے قرار رہتے تھے۔ تفصیل پڑنگاہ رکھتے۔ ہر رات پر تربیتی عمل کا انداز رکھتے۔

سائیں جی نے بھی قیامِ پاکستان سے بہت عرصہ پلے فرمایا تھا کہ اعلانِ جن میں ہو گا، اور ایک لکیر لکار فرمایا تھا: "ادھے ادھر اکھے ادھر۔ یہ باڈندری کیش کے فیصلے کے ساتھ اشارہ تھا۔ ان کو اٹھ سے ظاہر تھا کہ بزرگوں کا ایک گروہ ہند میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کے لیے بے قرار تھا، اور شاید علی طور پر اس کام میں مدد کر رہا تھا۔ لیکن اس مملکت کے قیام کا مقصد کیا تھا؟ اس لذ پر پرده پڑا تھا۔

جب میں پہلی مرتبہ راجہ محمد شفیع اور یوسف ظفر کے ساتھ عزیز ملک کی محیثت میں سائیں تھا۔

کے مزار پر پہنچا تو وہاں جنابِ جانِ محمد بٹ اور آغا حنفیت صاحب سے ملاقات ہو گئی۔

جانِ محمد بٹ، آغا حنفیت اور عزیز ملک سائیں صاحب کی خدمت میں سالہ ماسال بیٹھے تھے۔ پہلی ہی ملاقات پر سلسلہ گفتگو کے بغیر جانِ محمد بٹ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مفتی صاحب! آپ پاکستان کا فکر رہ کیا کریں۔ پاکستان کا فکر کرنے کے لیے بہت سے بزرگ موجود ہیں۔ یہ جو پرورہ کر کے لیتے ہوئے ہیں، انہوں نے سائیں اللہ بنیش کے مزار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ ساری عمر کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ موت کا تو انہوں نے سوانحِ رچار کہا ہے۔ مفتی صاحب، آپ پاکستان کا غمہ رکھا ہیں۔ آپ صرف یہ کریں کہ ہر کام کرتے وقت سوچیا کریں: میں کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہا جو پاکستان کے مناد کے منافی ہو لیں یہی کافی ہے۔ اور سے؟ میں نے سوچا۔ اس لمبے تڑپنگے غیر بزرگ شکل کے آدمی کو کیسے پتا پل گیا کہ پاکستان

میرے شالوں پر جزیرے کے تباہی کی طرح سوار ہے۔

پھر چند ایک دنوں کے بعد جناب جان محمد بٹ سے گفتگو کے دران میں نے چھر قسم کی بات چھیر دی۔ میں نے کہا ”اچھا پاکستان ہے یہ جس کے قیام پر سرحدوں پر لاکھوں مسلمان شہید کر دیے گئے۔“ بٹ صاحب مسکرائے۔ بولے ”مفتی صاحب، اگر آپ کوئی ملک بنایں تو اس کی حفاظت کے لیے سرحدوں پر گارڈز کا دستہ مستقیم کریں گے یا نہیں؟“ ”ضد رکریں گے“ میں نے کہا۔

”تو یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ نے اس مملکت کی حفاظت کے لیے اس کی سرحدوں پر لاکھوں شہیدوں کا دستہ مستقیم کر دیا۔ شہید ہر تاریخ میں نہ ہوا وہ ربہ دنیا تک ہماری حفاظت کریں گے۔“ یہ سُن کر میں بھروسہ کارہ گیا۔

”دیکھیے تا“ وہ بولے ”ان افراد کو شہادت کا درجہ نصیب ہوا اور انہیں ایک حفاظتی فوج میسر آئی۔ آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟“

جان محمد بٹ کی بالوں نے میرے دل میں پاکستان کی امتیازی حیثیت کے احساس کو درجند کر دیا، لیکن یہ امتیاز کیوں؟ کس لیے؟ کا عقدہ نہ گھلا۔ جب بھی میں ان سے کیوں کس لیے اپنچتا تودہ مسکرا کر کہا کرتے ”مفتی صاحب، آپ اللہ کی بالوں میں کیوں دخل دیتے ہیں؟“ وہ مالک ہے۔ جو چاہے اس کرے۔

جان محمد بٹ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے ”مفتی صاحب، مستقبل کی کھڑکی سے بھانکنے کا شوق چھڑ دیجیے۔ کیا فائدہ۔ اگر جانا ہے تو سرکار قیلہ کی نظریں ہوں گی۔ ان میں مستقبل کے واضح اشارے موجود ہیں۔“

ساٹیں جی کی نغموں کا بغور سطاع مر کرنے کے بعد مجھے چار بالوں کا پتالا ہوا:

- ۱۔ مملکت پاکستان کو حیران کرنے کی دستی حاصل ہو گی۔
- ۲۔ اس سلسلے میں شاہ ایران کوئی اہم کردار ادا کریں گے۔

- ۳۔ پاکستان کی خُداداد مملکت ایک روز صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بننے کی۔
 ۴۔ اور پھر نشأۃ ثانیہ کا دور شروع ہو جائے گا۔

انہی دنوں میرا ایک دوست ہالینڈ سے آیا اور کہنے لگا کہ ہالینڈ میں ہیگ کے قریب ایک گاؤں میں اسلامی کتابوں کی ایک عظیم لیبریری ہے، جس میں مطالعہ کرتے ہوئے ایک کتاب میری نظر سے گزدی، جس میں لکھا تھا کہ شاہ بتری اطیعت نے دوڑھائی سو سال سپلے فرمایا تھا کہ ہمارے قدموں میں ایک شہر آباد ہو گا، جو دنیا نے اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہو گا۔ ان کلائف سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کو نشأۃ ثانیہ کے سلسلے میں کوئی اہم خدمت ادا کرنی ہے۔
 ایک تو میرے سر پر پاکستان کا بھوت سوار تھا، دوسرا نشأۃ ثانیہ کا سوار ہو گیا۔ یہ

نشأۃ ثانیہ کیا چیز ہے، الجواب؟

تفقیریاً دس برس کی بات ہے کہ اسٹرالوجی پڑھتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ مغرب کے ماہر فلکیات ایک گولڈن انج کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ”ارے! یہ گولڈن انج کیا چیز ہے؟“
 میں نے سوچا۔

معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ عقدہ گھلکر مغربی ماہر سخنم اس بات پر متفق ہیں کہ کُرہ زمین پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جب زمین پر اطمینان، سکون اور امن کا دور دردہ ہو گا۔
 نہ جنگ و مجدل ہو گی مذہل طریقی بھگڑے۔ بس امن ہی امن ہو گا۔ شرخنم ہو جائے گا۔ غیر ای خیر رہ جائے گی۔

ان مشاہیر کا کہنا ہے کہ کُرہ زمین پر ایسے ایسے اور اتنے سارے مثبت اور مبارک سیاروں اور ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے جو آج تک کبھی نہیں ہوا۔

ان سیاروں اور ستاروں کا اثر سارے کُرہ زمین پر پڑے گا، اور یہ اثر اتنا صالح اور مبارک ہو گا کہ انسان کی زندگی ہی بدل جائے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ ستاروں کے یہ بھرمٹ کئی ایک سالوں سے زمین کی جانب بلاط ہے ہے ہیں، اور ۱۹۸۰ء میں ان کا اجتماع مکمل ہو جائے گا

اور دُنیا پر اشناز ہونا شروع ہو گا۔

اس تفصیل کو جاننے کے بعد ایک اور بات سیرے ذہن میں کرندی۔ ۸۰۰ عیسوی کا مطلبِ ابھری کی پسندیدہ صدی کی ابتداء ہوئی۔ پچھیں میں سنتا آیا تھا کہ چودھویں صدی میں حد ہو جائے گی۔ بے صحابی کی حد۔ لا دینیت کی حد۔ ہر بات کی حد میں نے پسند ہوئی صدی کی بات کبھی نہیں سُنی تھی۔ تو کیا ابھری کی پسندیدہ صدی میں حدیں ٹوٹ کر زندگی شروع ہونے والی ہے؟

ہر فہرست کے لوگ نشأة شایر پر ایمان رکھتے ہیں اور بڑی جلتے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔ عیسایوں کو یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ دربارہ دُنیا میں تشریف لا گئی گے۔ یہودی کا ایمان ہے کہ اللہ وہ سارے دعوے پر سے کرسے گا جو اس نے بھی اسرائیل سے کیا تھے۔ اندورام راجبر کے منتظر ہیں۔ مسلمان جناب محمدی زمان کے دور پر ایمان رکھتے ہیں۔

روہاسن کا ردیق توحید پر انس خود اس خیال کی حادی ہے کہ ہم ایک نیا مولہ مُرنے والے ہیں۔ ہمارے سامنے تینی کھڑکیاں ہلکتی جا رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پسیں ہم پر حیران کن حقائق کا راز کھونے کے لیے بے تاب ہے۔ کیا پتا کہ حقیقتِ کل پسیں کی کھڑکی سے جھانک کر ہمیں کامنات کا راز بتا دے۔

برٹنینڈرسل نے اپنی زندگی کے آخری ریام میں فرمایا تھا :

”میں چاہتا ہوں کہ مرتے سے پہلے وہ سب باتیں کہ ڈالوں جو میرے دل کی گمراہی میں ملچھی ہیں، لیکن مخفیں میں کہ نہیں پایا۔ جو جذبات سے نہیں بلکہ زندگی کے اس جھونکے سے تعلق رکھتی ہیں جو دُنور دُراز کے کسی بے نام مقام سے آتا ہے اور ہم انسانوں کی زندگی کو عظیم غصت سے بھر دیتا ہے، اور غیر انسانی تخلوق کی بے رحم اور بے انتہا طاقت کی خود دیتا ہے“ ڈی چادر ڈن کا کہنا ہے ”کامک قدر دُن کے حوالے سے جدید فریکس ہیں یہ سب پڑھاتا ہے کہ صرف محیر العقول ہی سچائی کے قریب ہو سکتی ہے۔“

جے بی اسیں بالائیں کہتا ہے "صرف یہی نہیں کہ حقیقت ہمارے اندازے سے زیادہ محیر اعلق ہے، بلکہ اس قدر محیر اعلق ہے کہ ہمارا تجھیں عجی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا" یہ تو کیلئے فریشست پارس مارٹن کا کہنا ہے "جدید سائنسی تحقیق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کا سائنسی علم روایتی سائنس کے خطوط پر نہیں چلے گا۔ اُٹا وہ ان تصورات پر مبنی ہو گا جنہیں ہم اس وقت ناقابل قبول سمجھتے ہیں"۔

لوی پاول کا کہنا ہے: نئے سائنسی حقالت ابھی چند خواص تک محدود ہیں۔ اگر وہ انھیں ظاہر کر دیں تو لوگ انھیں پاگل سمجھیں گے۔

لوی پاول اور جیکسن بر جراحتی کتاب "امپائل پاسی ٹیز" میں ان کھڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو آج سپسیں کے اُفون پر کھل رہی ہیں، نشاؤٹ نانیہ کے بارے میں لکھتے ہیں جس طرح سولہویں صدی میں احیائے علم کا دور شروع ہجھا تھا، اسی طرح آج ہم ایک نئے احیائے علم حقیقت کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ آج ہیومینٹک پلجر کی بنیادیں لڑکھڑا رہی ہیں۔ ٹیسیویں صدی کا علم دم توڑ رہا ہے۔ آج ہم کا سماں میں ایک نئی سمت کی تلاش ہیں جارہے ہیں۔ کل تک روایتی علوم کی جن حدود نے ہمیں جھکڑ رکھا تھا آج ہم وہ حدیں توڑ رہے ہیں۔ ہم میں ایک نئی بیداری کوڈٹ لے رہی ہے۔ ہم ہیزان گن حقالت کی طرف رواں دواں ہیں، جہاں بعید از امکان امکانات نظر آتے ہیں، جن کے تحت انسانی ذہن میں ایک عین اور عظیم انقلاب آنے والا ہے، جس کے زیر اثر انسانی ذہن میں تخلیق کے عقیم را نہ کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ آئیے، ہم سب انسان کے اس نئے جنم کا انتظار کریں"۔

ادب اور ادبیہ

ادب کی سب سے بڑی بدستی یہ ہے کہ اس کا نام ادب رکھ دیا گیا ہے۔ اس نام میں ایک دھوٹ ملفوٹ ہے کہ خبردار اپنے ادبی مذکونا نتیجہ یہ ہے کہ ادب پر اخلاق کا ہمیڈ کا سطبل بٹھا دیا گیا ہے۔

مجھے اخلاق کی اہمیت سے انکار نہیں۔ وقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں اخلاق کا کوئی مقنع تھیں نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اخلاق ایک اپاچ ہے جو ساروں کے بغیر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لہذا ادب پر اخلاق کے اجراہ داروں کی اجاہ داری ہے۔

مزہب کہتا ہے، میں اخلاق کا سرماہ ہوں۔ میرے بغیر اخلاق ایک ابے جان چیز ہے۔ چلو، یہ بھی مان لیتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مذہب خود ایک جنگی غلام کی طرح ہے جسے صدیوں سے کوئی مار کر اچھا خادم بنو کی تلقین کی جا رہی ہے۔

نیم عالمی اور ملاؤں نے صدیوں سے مذہب پر زین کس کر سواری کر رکھی ہے۔ ذاتی فقار اور افتخار کے حصول کے لیے انھوں نے مذہب کو ایک اربب کی حیثیت دے رکھی ہے، لہذا اخلاق خود مذہب کی نہیں بلکہ مذہب کے اجراہ داروں کے گھر کی لونڈی ہے۔ اخلاق وہ ہے جو انھیں گوارہ ہے۔ جو ناگوار خاطر ہے، بدل خلائق ہے۔

رسم درواج کہتے ہیں، اخلاق ہماری گود میں پلا ہے۔ ہم نے اس کا منفرد دھولا یا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا ہے۔ اس کی پچان یہ ہے کہ اس پر ہماری چھاپ لگی ہے۔ ہماری چھاپ نہ ہو تو ماں جملی ہے۔

یوں اخلاق کے احوارہ داروں نے تخلیق کرنے والوں پر پابندیاں لگا رکھی ہیں : اپنے
کرداروں کو ابھی کچھ پہناؤ۔ ان کے برتاؤ کو رسم کی سُنْهَرِی زنجروں سے سجاو۔ کیل جو چاہے
مگر یہ طاہر نہ ہونے پائے کہ وہ اخلاق کی حد بندیوں سے باہر نکلا چاہتے ہیں اور
قلم کو ضبط سکھاؤ، ادب نکالوں کو
اگر ادب کا نام تخلیق ہوتا تو تخلیق کا رپرپرے دار نہ بیٹھے ہوتے۔
تخلیق کا رتے منظر کشی کی۔ بولا :

ماں بچے کو گدیں لیں یعنی ہے۔ باپ ہٹھ پر رہا ہے۔

اخلاق کے احوارہ دار چنکے۔ کیا کہا؟ باپ ہٹھ پر رہا ہے؟ بے شک باپ حق پسیے ہیں۔
اخیل حق پسینے کی عادت ہے۔ لیکن باپ کا ہٹھ پسیے ہوئے دکھانا محسن نہیں۔ باپ کو اس حرکت
کا سزاوار دکھانا اخلاق کے منافی ہے۔ لوگ کہیں گے مرتبک باپ ہوتے ہوئے جی بدنخت حق پسیا ہے۔
بچے رپ کی اثر مرتب ہوگا؛ بچے میں خود پیدا ہو جائے گا کہ بڑا ہو کر مجھے باپ کی چلیں جھرنی
پڑیں گی۔

جدید ندوی کے علم بردار بولے "حق پینا ایک غلیظاً اور فرسودہ رسم ہے۔ ایسی فرمودہ
بالوں کو اپھاننا ادب کی شاہ راہ پر بیٹھ کر گندے پوتوڑے دھونے کے متراود ہے۔ ہاں، اگر
باپ حق پسیے تو کوئی مضائقہ نہیں" ۱

حفظانِ صحت والے چونکے۔ بولے "نہ نہ - باپ کو سگرٹ نہ پلانا۔ بچہ کیلے کے گا
کہ میرا باپ حالاتِ حاضر سے اس قدر بے خبر ہے۔ اسے اتنا ہی پتا نہیں کہ سگرٹ پینا لیں سر
پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اس کے ہاتھ میں سگار تھا در" ۲

نتیجہ یہ ہے کہ ای ہوں کی کیفیت ہمیشہ سے ایس پ کے انسانے کے اس باپ اور
بیٹے کی سی رہی جو گھر ہائیجن کے لیے گاڈیں سے شہر کی طرف مازم سفر ہوئے تھے۔
ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ کسی مسخرے نے تخلیق کا نام ادب رکھ دیا۔

آپ کہیں گے، یہ صفتی ادب کے پردوے میں کیا طوامینا کی کہانیاں لے دیٹھا یعنی
کچھ یہ طوامینا کی کہانیاں آپ یعنیوں سے اخذ کی گئی ہیں۔
جن دنوں مجھے تخترا فضائے لکھنے کا مرض لاحق ہوا ان دنوں میں ایک مدرسے میں
معلم تھا۔

برسیلِ تذکرہ ان دنوں مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں ادب لکھتا ہوں۔ کیونکہ ان
دنوں ادب کا لفظ بخوبی میں رائج نہیں تھا اور ہم اس خوش فہمی میں تھے کہ یہ امر بچیر ہے۔ ان دنوں
میں اس لیے لکھنے پر بجور تھا کہ اتفاقاً میری پہلی تحریر پر تالیبی تھی۔
میں تالیب کا جھوکا تھا۔ گھر میں کوئی درخواست اتنا نہ سمجھتا تھا۔ چونکہ ڈرپک اور شریلہ تھا،
لہذا جعل کا کوئی ہم عمر مجھے ساختی بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ سکول میں نالائق ہوتے کی وجہ
سے کسی گندی شمار میں نہ تھا۔ ایسے حالات میں ایک بار تالیب کی آداز من کمادسان کھو یا بیٹھا۔ ایک
بار سُنی ہے دوسری بار سُننے کی ہو سے ہے۔

اگر اس وقت مجھے پتال جاتا کہ ادب میں پاؤں دھر رہا ہوں تو درکر بھاگ اٹھتا
کیونکہ ان دنوں ادب میرے لیے ایک دھوپی تھی۔

گھر سے دن رات اپا اپی کی آدازیں سُنائی دیتیں : با ادب ! بالا حظیرا! ہوشیار!
خلتے کے چوگان سے بڑے بُڑے گزرتے تو ان کے کھنکھاڑا چلا کر کہتے "با ادب ! ہوشیار!"
سکول میں اساتذہ کی خشیگیں لگاہیں جبراہ کرتی رہتیں۔

جن دنوں مجھے افسنے لکھنے کا مرض لاحق ہوا ان دنوں میں ایک مدرسے میں حملہ تھا۔
خوش قسمتی سے مدرسے میں میرانام متاز حسین تھا۔ مگر ارد ہجریدوں میں متاز صفتی چھپتا تھا۔ چونکہ
لوگوں سے ملنے کی عادت نہ تھی اور ادبی مخلوقوں میں نہ جاتا تھا، اس لیے عرصہ دراز تک پردوہ
پڑا رہا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ماسٹر متاز حسین افسنے لکھنے کے جرم کا تکمیل ہو رہا ہے۔
پہلی مرتبہ جب یہ رانہ مشکارہ ہوا تو مدرسے کے اساتذہ ہسکا بکارہ گئے۔ چور دوہ

اڑ راہ ہمدردی و فندکی صورت میں میرے پاس آئے۔ کہنے لگے ”میاں، جو ہذا سوہنڈا۔ ہم اس کا تذکرہ نہیں کریں گے، بشرطیکر تم آئندہ سے توبہ کرو، درینہ اگر ہیدھ ماسٹر صاحب کو پتا پل گیا تو بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی“

ایک بولا ”مجھی صاحب، یہ میدانِ ادب ہے۔ اس میں چھپھوندریں نہ چلاڑی۔“
دوسرے بولا ”یہ آج کے افسانے جو ہیں، یہ ادب نہیں، خرافات ہیں۔ بے ادبیاں ہیں“
تیسرا بولا ”اگر ضرور ادب ہی لکھنا ہے تو اخلاقیات پر لکھو، اسلامیات پر لکھو“
چوتھا بولا ”اگر بچوں کو پتا پل گیا کہ تم ان خرافات کے مصنف ہو تو ان کے دلوں میں تھاری کیا عزت رہ جائے گی؟ ذرا سوچ۔ اور اگر بچوں کے والدین کو پتا پل گیا تو وہ اپنے بچوں کو اس مدرسے اٹھا لیں گے“

بھراں میں سے دو ایک بچھوں نے ممتاز مفتی کی تحریروں کو پڑھا تھا، میرے افسانوں کے باب پر تپی رہا ہے، ”گناہ نے لگے۔ اس کے بعد ہی ہو جس کا ذرخوا۔ بات نکل گئی۔“
ہیدھ ماسٹر نے کمیں بنایا ایں۔ ایم شریف کو بیجع دیا جوان دلوں ہماسے اپنکر رہتے۔
ایس۔ ایم شریف کے میرے والدے مراسم تھے۔ اخھوں نے ابا کو خط لکھا۔ گھر جو پڑے ہی اجنیت سے بھرا ہوا تھا، اب غم و غصہ سے بھر گیا۔

ادھر شریف نے سرکاری طور پر طلب کر لیا۔ پہلے تو ڈانٹتے رہے کہ اگر طلباء کے اخلاق کے رکھوائے خود ادبی بد اخلاقی کا پرچار کرنے لگیں تو تعلیم و تدریس کا کیا بننے گا؟
آخریں مسکرا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے ”بھئی، اگر لکھنا ہی ہے تو انگریزی میں لکھو۔ لڑپر لکھو۔ اردو میں ادب کیوں لکھتے ہو؟“

اس نہذ میری سمجھ میں آیا کہ لڑپر اور ادب میں کیا فرق ہے۔

آج کا نوجوان ادیب سمجھتا ہے کہ پرانے ادیبوں نے حقائق سے محفوظ رہے رکھا اور وہ ادب میں اخلاق، رسوم اور مذہب کی ذرائعات کے نرم اور خوشبو دار جھاگتے بلکہ

بناتے رہے۔ ملائم مخلصین بالتوں سے قاری کو جھرماتے رہے۔ منافقت کے سفرے جال پچاتے رہے۔ لیکن کچھ پردا نہیں۔ اب میں آگیا ہوں۔ میں انقلاب کا نمرہ لے کر آیا ہوں۔ میں پُرانے وقاروںی ادب کو رد کر کے انقلابی ادب کی داغ بیل ڈالوں گا۔

۱۹۳۶ء میں میں بھی یعنی بھتا تھا کہ مجھے خدا نے پڑانے بُت توڑنے کے لیے پیدا کیا ہے اور مجھ سے پہلے آئے دا لے ادیب منافقت کا شکار تھے۔ حقائق کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔ میں کما کرتا تھا "میں آگیا ہوں۔ جگر خام کے بیٹھو۔" مجھے یقین ہے کہ ۱۹۳۶ء کا ادیب بھی میں میں کرتا ہوا ایوانِ ادب میں داخل ہوا تھا۔

آج پرانے ادیب نئے ادبوں پر ہنسنے ہیں۔ کیا پرانی کیا پدی کا شردار با۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ مستند ادیب کی مستند پر بیٹھو کر سامنے استادہ نئے ادیب پر ہنسوں۔ لیکن جب ہنسنے لگتا ہوں تو مجھے ۱۹۳۶ء کا ندانہ یاد آ جاتا ہے جب مستند ادب پر بیٹھے ہوئے سکھ بندادیب جو پرہنسا کرتے تھے۔ میری ہنسی کا فوراً ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ادیب کون ہے؟ کیا ہے؟ سمجھی اس بات پر منفق ہیں کہ ادیب وہ ہے جس کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے اور وہ اس انداز سے کہنا چاہتے ہے کہ بات ہمچ جائے۔ کہنے کے لیے ادیب کے پاس کچھ ہونا ضروری ہے۔ ایک زاویہ نظر ہو۔ ہٹ کر۔ منفرد۔

اب سوال یہ ہے کہ ادب لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سیانے کہتے ہیں کہ اس لیے ضرورت ہے کہ حقائق جو بہت قریب ہیں، ماں سیت کی ادیب میں آ جاتے ہیں۔ لیکن جانیے ماں سیت ایک بہت بڑا پروردہ ہے! بہت بڑا بہت دیسر۔

ہمارا ج ایک تقریب میں باہر جانے لگے۔ محل سے باہر نکلے تو دفعہ اخیں یاد آیا کہ گپڑا یہ سننا تو وہ بھول ہی گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھی الکاروں سے فرمایا "بھی، سر پر پٹھی رکھنا تو ہم بھول ہی گئے۔" صحتی اہل کار، جو ادب سے سر پھکائے کھڑے تھے، بھل کے

بھلے گے محل میں گئے۔ تماش بسیار کے باوجود ہمارا ج کی پگڑی نہ ملی۔ دلپس آئے۔ عرض کی تھی اسی پگڑی اندر تو نہیں؟ اسی وقت کسی نذر چوب دار کی نظر ہمارا ج کے سر پر پیدا ہوئی۔ اس نے چلا کر کہا "ہمارا ج، پگڑی تو آپ کے سر پر ہے"۔

ہمارا ج نے دونوں ہاتھوں سے پگڑی کو ٹھنڈا اور پھر خوش ہو کر فرمایا "اچھا کیا جو تم نے ہمیں یاد دلایا اور نہ ہم تقریب میں نسلکے سر ہی جا پہنچتے"۔

میری دانست میں وہ نذر چوب دار جس میں اتنی جرأت تھی کہ ادب اور احترام کے باوجود گردن اٹھا کر ہمارا ج کے سر کی طرف دیکھ سکے، ادیب تھا۔

ادیب کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو یاد دلاتا رہے کہ جناب والا، گوپی تو آپ کے سر پر ہے۔ اور لوگ اخین نسلکے سر گھونٹنے پھرنے سے بچائے۔

عالم صرف سوچتا ہے اداپنی فکر کو پیش کر دیتا ہے۔ عالم کا پیغام ذہنوں تک محدود رہتا ہے۔ ادیب میں ایک ٹرانسفادر لگا ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ اپنی سوچ کو جذبات کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔ پھر وہ شدت کے الاؤ سے بھی گرتا ہے۔ اور گرتا ہے۔ دل جلا کر گرتا ہے۔ جھی کر فکر جذبات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر وہ اسے ٹرانسٹ کرتا ہے۔ اس لیے ادیب کا پیغام دلوں کی دھڑکنیوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

بھر طور، ادیب میں شدت کا ہونالا نرم ہے۔ شدت کی کیفیت یوں سمجھ لیجیے کہ ٹرکھا ہے، لیکن ابھن جل رہا ہے۔ یا یوں کہ گاڑی کو پہلے گیئر میں ڈال کر آپ ۶۰ میل کی رفتار پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ادیب کو دوسروں کا دکھ اپانا ادھرستنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ایک من دکھ سیں تو تحریر میں صرف ایک تولہ دکھ ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ ادیب ایک تو شدت کا شکار ہے، دوسروے دکھ کا۔ اور تخلیق ایک دکھ محبرا عمل ہے۔

تخلیق کے کوب سے بھرے ہوئے عمل میں قدرت نے کیف کی ایک شمع روشن کر دی ہے۔ کیف کی یہ شمع انعام نہیں بلکہ ایک جاہ ہے کہ چیزیں ہوئی چھلیاں تکلنے نہ پائیں۔ لیکن آپ کمیں گے یہ کیا تماشا ہے کہ میں ایک دم شدت سے دُکھ پر آپنی ہے یہ بات قابلِ وضاحت ہے کہ شدت بناتِ خود دُکھ ہے، اچھے سے وہ خوشی کے جذبات کی شدت ہو یا غم کے۔

سوال یہ ہے کہ شدت کیا ہے؟ شدت ایک بلیک ہوں ہے جس میں مشکل ہیں آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے لیکن جس میں ۱۲۰ آدمی عظیں دیے گئے ہیں۔ شدت اس موڑ کار کے مصدقہ ہے جسے فٹ گیریں میں ڈال کر۔ ہمیں کی رفتار سے چلایا جا رہا ہو۔ سرکس کے اس بوڑھے شیر کے مصدقہ ہے جسے کوڑے مارنا کہ شندی پر ابھارا جا رہا ہو۔

نفیات کے مطابق خوشی ایک سطحی جذبہ ہے جو زندگی کے لئے ودقِ حواریں یہاں دیاں دُور دُور بھرے ہوئے نخلستاں کی حیثیت رکھتا ہے، اور سباتی چاروں جانب پھیل ہوئی ہوئی ریت ہی ریت، دُکھ ہی دُکھ۔

ادیب وہ احمد ہے جو شدت کی بھی تپائے بیٹھا ہے۔ جو شدت کے بلیک ہوں اگھن میں زندگی گزار رہا ہے۔ جو اپنے جسم کی مشین کو پہلے گیریں میں ڈال کر اسے۔ ہمیں کی رفتار سے ندرا رہا ہے۔

یہ سب کس لیے؟ کس خوشی میں؟ کیا شہرت کی ایک تالی کے لیے جو کبھی مسلسل نہیں بھتی؟ کیا تخلیق کے کیف کے لیے جو انعام نہیں بلکہ ایک جاہ ہے؟
ہم کمیں فریپ کھاتے جاتے پر مصرا ہیں؟ ذرا سوچیے تو ہماری کیفیت بالکل ایسے ہے کہ:

ن پوچھ جاں، میں وہ چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے قافہِ روانہ ہوا

ان وجہات کی بنابر میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ دوستو، تخلیق کاری کے

اس جسم سے اپنے آپ کو بچا لے۔ اس ادب بازی سے توہیر کرلو۔ اب بھی وقت ہے۔ ابھی توہیر کے دروانے بن دئیں ہوئے۔

میں خصوصاً نوجوان ادیبوں سے اپیل کرتا ہوں کہ یہ تالی جس کی امید پر آپ میں میں“ کر کے بڑے طمثراق سے ایوان ادب میں داخل ہو سبھے ہیں تاکہ اپنے آپ کو قربانی کا بگرا بنائیں، یہ تالی بہت منگی پڑتی ہے بہت منگی۔ اول توہیر تالی بھتی نہیں۔ بخ جائے تو جلد ہی رُک جاتی ہے میسلسل نہیں بھتی۔ اور پھر آپ میری طرح اس تالی کو سُنتے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں۔

لیکن ٹھہریتے۔ ابھی توہین نے صرف شدت کی وضاحت کی ہے۔ ابھی میں نے شدت کے اثرات کا تذکرہ نہیں کیا۔

موٹی بات کہ دوں۔ اگر آپ شدت زدہ ہیں لیکن ادیب ہیں تو بگم سے آپ کی کبھی نہیں بننے گی۔ ہمیشہ آن بن رہے گی۔ ماں باپ سے نہیں بننے گی۔ ہم کا عمل یہ نہیں بننے گی۔ افسروں سے نہیں بننے گی۔ کسی سے نہیں بننے گی۔ ظاہر ہے اگر آپ شدت کے سکوڑ پسوار ہیں تو پیدل چلنے والوں سے آپ کا کیا داسطہ۔

صرف افراد کی بات نہیں، بذات خود زندگی سے آپ کی ہم آہنگی نہیں ہوگی۔ اگر آپ میں شدت ہے تو آپ کی یہیت ایسی ہے جیسے دال میں ”کوکڑا“ ہوتے ہیں۔ وہ دانے جو کبھی نہیں گلتے۔ جن میں گلنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ یعنی اگر آپ میں شدت ہے تو آپ میں ایڈجسٹڈ ہیں۔

انگریز بڑا سیانا تھا۔ اس نے ایک خفیہ اصول مرتب کیا تھا کہ ادبی طبیعت کے لوگوں کو سول یا مطری کے بڑے عمدوں پر فائز رہ کیا جائے۔ اس اصول کو علی شکل دینے کے لیے اس نے پرسنلیٹی میسٹ ایجاد کیے تھے اور شرعاً گاہی بھتی کر امیدواروں کو یہ میسٹ دیے جائیں۔ ان ٹیسٹوں میں دل کے سات پر عوں میں دبی ہوئی شدت اپنا پتا دے دیتی تھی۔

انگریز نے چناؤ کرنے والے بورڈ کو تاکید کر دی تھی کہ کئی نالائیں اسیدہ اپاں ہو جائے تو مضایقہ نہیں لیکن خبردار اکٹی ایسا اسیدہ وار سرو سریں میں نہ آنے پائے جس کی سرست میں ادبی شدت یا ادبی روحان ہو۔

انگریز کا یہ اصول آج بھی راجح ہے۔ پہلے جان بوجھ کر راجح تھا۔ اب شاید ان جانے میں راجح ہے۔ لیکن ٹھہری۔ ہو سکتے ہے حکومت کراس اصول کا علم ہو اور حکومت نے اس لیے اس مشنوخ نہ کیا ہو کر وہ ای برس کی خیر خواہ ہے، بد خواہ نہیں۔

اس کے باوجود آج بھی کئی ادبی طبیعت لوگ چوری پچھے اونچے عمدوں پر بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی رجحانات کو کیما فلاؤ کر رکھا ہے۔ اینٹنسٹیٹشن اور ادبی طبیعت توازل سے دشمن چلے آتے ہیں۔ یہ اوصاف ایک دوسرا کی مندر ہیں۔ حرکت اور قیام کمی ساختی نہیں بن سکے۔ کھتے ہیں گانے والی کا کام نہ چلے تو پان کی دکان کھول لیتی ہے۔ ادبی کا کام نہ چلے تو وہ نقاد بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ آج ادب کی کیا کیفیت ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا کوئی قاری نہیں۔ قاری کی عدم موجودگی میں اپنے اپ کو تسلی دینے کے لیے ہم نے جگہ جگہ اب اب ذوق کے حلقت بنارکھے ہیں۔ ان مغلوں میں ہم من ترا حاجی گویم تو مر حاجی یگو سے اپنی اتائی تسلیں کرتے رہتے ہیں۔

اگر ہمارا کوئی قاری ہو جی تو وہ بدنصیب سزا مجبور ہے، کیونکہ کاغذ کی قلت کی وجہ سے کتاب کی تمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کتاب خریدنا ایک اوسط درجے کے اکدمی کے لیے ممکن نہیں رہا۔ چینی کو سب سیڑا ایکس کیا جا سکتا ہے۔ بناسپتی پر کنڑوں رویت عاید کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کتاب جیسی غیر ضروری چیز ممکن ہوتی ہے تو ہوا کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ادبی جریدے نزع کے عالم میں بسک رہے ہیں۔ خیں کاغذ نہیں ملتا۔ کیوں نہیں ملتا؟ تفصیلات کا لو جھے علم نہیں البتہ سنتے میں آیا ہے کہ

وزارتِ اطلاعات صرف اسے گاڑی تسلیم کرتی ہے جو چلتی ہو۔ اسے نہیں جو نہ چلتی ہو۔ لہذا وہ چلتی میں کوشش ڈالتی ہے۔ آج کل کے دور میں ادب نہیں چلتا، سیاست چلتی ہے۔ لہذا کاغذ اخباروں کو ملتا ہے۔

ادبی جریدوں کو کاغذ نہیں ملتا۔ بلیک میں خریدنے کی استطاعت نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پرچھ پرچھ چوتھینے کے بعد لکھتا ہے۔ مجھ سے پوچھئے تو ہم اس صورتِ حالات پر بہت خوش ہوں۔ نوجوانوں میں ادبی روحانات کی بیخ نکنی کے لیے اس سے زیادہ موثر طریق کا رکیا ہو سکتا ہے؟ میرے نقطہ نظر کے مطابق یہ صورتِ حال بہت ہی امیدافزار ہے۔ ہمیں دنارت اطلاعات کا شکر گذاہ ہونا چاہیے کہ وہ ادبی رسائل کو کاغذ کا کٹا دینے میں بخل سے کام لے کر اس میں ایڈ جنڈہ گردہ کے لیے جسے ادیب کہتے ہیں، صحت منداز نہ لگی بس کرنے کا راستہ ہمارا کردار ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے بڑی دُوسرے انڈیش پالیسی اختیار کر دی ہے۔ امداد دینے کے لیے وزارتِ تعلیم نے جو مدبنار کی ہے اس کا نام لمنڈ بادیز ہے۔ لمنڈ بادیز کی مدد کا وجود ہی نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ادب اور علم دو مختلف چیزوں ہیں۔ ان میں کوئی تہم آہنگ نہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک دُوسرے کے منافی ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دل اور ذہن ایشہ ہی برس پریکار رہتے ہیں۔

حکومت ادیبوں کی ہمدرد ہے۔ ان کی اعانت کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ بلیک اعانت کے لیے حکومت نے ایک شرط عاید کر دی ہے۔ پوری امداد حاصل کرنے کے لیے ادیب پر لازم ہے کہ وہ مر جائے۔ اگر اپنے کے لیے تیار نہیں تو کم از کم خطناک طور پر یہاں پڑھانا ضروری ہے۔ یہاں پڑھاؤ تو وزارتِ اطلاعات کی سفارش پر سپتال اور دوائی کے خرچ کے علاوہ دو وقت کی روٹی بھی ملتی ہے۔

یقین جانیے، سر جانا بہت مشکل کام ہے۔ میں کتنی ایک بیس سے سلسلہ کو شش کر دے ہوں، بلیک بھی تک کامیاب نہیں ہوں۔ میں نے بھارت ایک بھی آنذا دیکھا۔

تیسرا بات یہ ہے کہ ادبیوں کو پبلشر نہیں ملتا۔ اگر مل جائے تو پبلش کی دو شرطیں ہوتی ہیں: پہلی یہ کہ آپ کی تصنیف نادل ہو۔ اس میں نسیم سحری چلے، بھول کھلیں، کوئی کوئے اور اس پر نظر پر یہ رادیو ایر ڈن رومنی مکالموں کے فارمے چلا دیں۔ مجھے ان کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ لیکن دلت یہ ہے کہ ان کی دوسری شرط بڑی ٹیڑھی ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اپنا نام بدل کر فیروزہ خالتوں رکھ لوں۔

حفیظ ہوشیار پوری یہ بتتا یہے فرت ہو گیا کہ اس کا دیوان چھپ جائے۔ اور بہت اچھا کیا اس نے کہ فرت ہو گیا۔ ورنہ دیوان نہ چھپتا۔

میں نے حال ہی میں اپنی ایک کتاب کے بارے میں ایک پبلش سے بات کی۔ اس نے بڑے ادب اور احترام سے معذرت کر دی کہنے لگا "جناب والا، ہم تو مصنفوں کی چیزوں پھاپتے ہیں، آپ تو مصنفوں کے مصنفوں ہیں!" اس کا یہ جملہ میرے دل میں خوشی کے کے اتنے انبار لگا گیا کہ کتاب چھپانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

محمد فضیل نے مجھ سے کہا "میری صرف ایک خواہش ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ نقش کے نظر ثانی شدہ نمبر چھاپ دے۔" میں نے پوچھا کہ اگر تھاری یہ خواہش پوری ہو جائے تو تھیں کیا چاہیں ہو گا؟ بولا "بھر میں سکون کی موت مرسکوں گا۔" میں نے کہا "بھائی، اگر تم بے سکون کی موت مرجانے کی روحت کر لو تو ممکن ہے تھاری یہ خواہش پوری ہو جائے۔ صرف ایک شرط ہے کہ مرنے میں تاثیر نہ کرو۔ اگر تم نے فیصلہ کرنے میں حینظا جان ہری کی طرح دیر لگا دی تو لوگ نقوش کو بھول جائیں گے۔ بھر موت بھی کام نہ آئے گی۔"

اس مشکل سے نکلنے کے لیے میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک اشتہار کے ذریعے اعلان کر دوں کہ جو پبلشر میری کتاب چھاپے اور نیچے گا، اس سے رائٹنگز ڈھول کرنے کے بجائے میں خدا سے اپنی جیب سے نقد رائٹنگز ادا کر دیں گا۔ صرف پبلش کی بات ہی نہیں، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آئیئے اپنے آپ کو زندہ اور چالو رکھنے کے لیے ہم

ریڈیو اور ٹی وی کو بھی اپنے پروگرام کے عوام پسیساً ادا کرنے کی پیش کش کر دیں۔ کئی ایک سال پہلے حکومت پنجاب نے ادیبوں کے لیے مکانات بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر ریاست حکومت کی سمجھیں ہیں اُبھی اور اُس نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے کہ مکانات ادیبوں کو نہیں بلکہ فنchal صاحفوں کو دیے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہیں پھر سے ادیبوں کو مکانات دینے کی بات نہ چل نکلے۔ کہیں ادیب آباد نہ ہو جائیں۔ کہیں ادیب آرام سے دودت کھانے نہ لگیں۔ کہیں ادیب کسی گنتی شماویں نہ آ جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو نوجوانوں کے دلوں میں ادیب بننے کی خواہش پیدا ہو جائے گی اور ان کی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔

آخر میں میں اُپ سے پھر اپل کرتا ہوں کہ دوستو، تخلیق کاری کے اس جہنم سے اپنے اُپ کو بچاؤ۔ رشدت کے اس تندور سے اپنے اُپ کو نکال لو۔ میں اُدھمٹ کے جہنم سے نکلو۔ ادب کے اس لئے در حقیقت میں کس اُمید پر بیٹھے ہو، جہاں قاری نہیں، پبلیشور نہیں، جریدہ نہیں؛ ایک تالی کی اُمید پر؟

(حلقة اربابِ ذوق اسلام آباد کے سالانہ اجلاس کے لیے لکھا گیا)

کلچر میمینار اور ادیب

ہمارے مال آج کل کلچر کا تیتر بول رہا ہے۔ لوگ پوچھ رہے ہیں؛ کیا کتنا ہے؟ صاحب اور سیم کہتے ہیں "کہ رہا ہے، ڈنائیٹر روم سجا، مخفی بگاڑ کانٹری بیوی بول، منی پس اور کپڑہ بن جا"! سیاست دالوں سے پوچھ تو وہ کہتے ہیں "کلچر ایک ہتھیار ہے جسے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے" نوجوان سے پوچھ تو وہ کہتا ہے "بال بڑھاڑ، زندگ دار گرتے پستو اور کوکا کولا پیز" کسی یونیورسٹی سے پوچھ تو وہ کہتی ہے "کھراڑ نہیں۔ ہم نے خالص امریکی خطوط پر ریسرچ کا ادارہ بنادیا ہے جو بہت جلد پاکستانی کلچر کا سارا بکھیرا حل کر دے گا"! فلم کاروں سے پوچھ تو جواب دیتے ہیں "ہم نے پنجابی فلموں میں پنجاب کے کلچر کی وضاحت کر دی ہے۔ اب یہ گاؤں دالوں کا کام ہے کہ وہ اپنی زندگی اس کے مطابق دھالیں"! دسراستِ تعلیم سے پوچھ تو وہ کہے گی "ہم نے تو اس کام کے لیے آرٹ کو نسلیں بنادی ہیں۔ اب کو نسلیں جانیں اور ان کا کام یہ کوشاں سے پوچھ تو وہ کہیں گی "سیدھی بات ہے کلچر کا مطلب ہے تو ایاں کڑا، فرانسیسی ڈرائے لکھدا وہ باہر سے آنے والے ٹرد پیز کانزندہ ناج کماؤ۔ اللہ اللہ خیر سزا"!

اہل زبان سے پوچھ تو وہ کہیں گے "میاں کلچر زبان کا ایک جزو ہے۔ اپنے عاق ٹھیک کر لے تو حمد ہے وہ مدنی بن جاؤ گے درہ ڈھنگے کے ڈھنگے رہ جاؤ گے" ادیبوں سے پوچھ تو لیکن ادیبوں کو پوچھتا ہی کون ہے؟ دسراستِ تعلیم نہیں پوچھتی۔ بلے چاری مجبور ہے۔ چونکہ علم درست ہے لہذا صرف

لندن بارڈین کی دکان سمجھے بیٹھی ہے۔ وزارت اطلاعات نہیں پوچھتی۔ شکرے نہیں پوچھتی۔ جو پوچھے تو صرف اس خیال سے پوچھے گی کہ ادیبوں سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ آرٹ کو نسل کیوں پوچھے؟ اسے تو صرف آرٹ اور آرٹسٹ سے تعلق ہے۔ آرٹ کو نسل کے نزدیک آرٹ کا مطلب خالص "ماد" ہے اور آرٹسٹ وہ ہے جس نے ٹوپی وی پرروں کر رکھا ہو۔ عالم اور دانشور نہیں پوچھتے کیونکہ ان کے نزدیک علم وہ ہے جس میں سے کتاب کی جو آئے اور جو مسائل کو حل کرنے کی بجائے اُٹا اخھیں مزید اُجھاد سے۔ شاید اسی لیے تلقین شاہ بار بار کہا کرتے ہیں کہ پاکستان اور اسلام کو کبھی کسی ان پڑھنے نقشان نہیں پہنچایا۔

آج ہمارے سامنے ایک اہم مسئلہ ہے "کھجور اور ادب"۔ امریکا نے اہم مسائل کو حل کرنے کا جدید طریقہ دعمنگ کر دیا ہے۔ کوئی حل طلب مسئلہ ہو اس پر سینیار کردا درد۔ سینیار کرنے کے لیے در باقیں ضروری ہیں۔ ایک توکرائی کنڈیشنڈ ہو، دوسرا کلام اور طعام ساتھ ساتھ چلیں۔ اس لحاظ سے حلقہ اربابِ ذوق کا یہ سینیار خام ہے۔ کیونکہ اس میں خالی کلام ہی کلام سے نہ کمرا اٹرکنڈیشنڈ ہے، نہ طعام کی خوشبو آہی ہے۔

آپس کی بات ہے۔ کہ دونوں تو کیا ہر ج ہے۔ نفیات کے لحاظ سے ادیب پڑھتے ہوتے ہیں۔ کسی کو کچھ کہرتے دیکھ کر مچل اٹھتے ہیں کہ "میں بھی"۔ یہ سینیار بھی غالباً اسی جذبے کے تحت کرایا گیا ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھ میں کہ سینیار دوسروں کو دھانے، بغروں پر رعب ڈالنے یا بڑے آدمیوں کو ممتاز کرنے کے لیے کرایا جا رہا ہے۔ نہیں۔ اسی کوئی بات نہیں۔ صرف اس لیے کرایا جا رہا ہے کہ اپنے آپ کو وصلہ دیں کہ ہم بھی مُختیں میں زبان رکھتے ہیں۔

حال ہی میں رومانیہ کے شہر بخارست میں ایک عالمی سینیار ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کے دو بھائی بھی جا پہنچے۔ ایک بھائی نے دوسرے سے پوچھا:

"یہ کیسا دولا گولہ ہے؟"

”سینیار ہورتا ہے“ دوسرے نے جواب دیا۔

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”سیاں کا اکٹھ ہوتا ہے“

”اکٹھ ہو کر سیانے کیا کرتے ہیں؟“

”باتیں کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔“

”پھر؟“

”پھر باتیں کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔“

”پھر؟“

”پھر باتیں کرتے ہیں، پھر کھاتے پیتے ہیں۔ پھر باتیں کرتے ہیں، پھر کھاتے پیتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسئلہ حل ہرجاتا ہے۔“

سینیار کے متعلق ابن انسا اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں :

”در حاضر کی جدید تین ایجاد سینیار ہے۔ کوئی مسئلہ ہوا کرئی مسئلک ہو، سینیار کرائیے اور بھلے چنگے ہو جائیے۔ سینیار میں اور بھی کتنی ایک خوبیاں ہیں۔ کسی پر ملیٹھے بھائے کام ہو جاتا ہے۔ کچھ رے بھی نہیں ہوتے۔“

ابن انسا نے اپنے کالم میں کھانے پینے کی بات نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ طبعاً وہ نک ہرام نہیں ہیں۔ بلکہ حتیٰ نک ادا کرنے کے شدت سے قائل ہیں۔ بہ طور کھانا پیسا سینیار کا ضروری جزد ہوتا ہے۔ جو چاہو کھاؤ پیو۔ چاہے چائے پیو۔ چاہے آش کیم کھاؤ۔ چاہے کوک پر گزارہ کرو۔ یا وہ پیو جسے پیے بغیر کچڑ ہونے کا دعوے عبتوں ہے۔ باں تو ابن انسا لکھتے ہیں :

”آج کل سینیاروں کی رویں پیل ہے۔ کمیں قوم کے حالات پر سینیار کمیں مجھ ترول کی بہتان پر سینیار۔“

صرف بیمارست میں ہی نہیں ہمارے ہاں بھی اصلی اور "وڈٹے" سینیار ہوتے رہتے ہیں۔ آج کے سینیار کی طرح دیسی اور غیر مذکوب سینیار نہیں بلکہ پچھر ڈ سینیار۔ ابھی پچھلے جیتنے ہی انظر کان میں پچھر کے مو صدیع پر سینیار ہرا ہتا۔ اس سینیار میں "زینو" نے کہا تھا: "ہمارے ہاں دستور ہے کہ پچھر پر باتیں ہوتی ہیں یعنی زبانی باتیں۔ تخلیق نہیں ہوتی۔"

پچھر کے ادارے صرف زندہ ناج گانے کو اکر سرخرو ہو جاتے ہیں۔"

انظر کان کے اس سینیار کی روشنی اور ابین انشا لکھتے ہیں :

"سینیار میں سوال اٹھا کر پاکتائی پچھر کیا ہوتا ہے؟ یہ سوال اٹھا تو اٹھتا ہی چلا گیا۔ اسے بھانا مشکل ہو گیا۔ جب ملزم پکڑا ہی رجاء کا تو اسے سزا دینا کیا معنی؟ اور بڑے شہروں میں سربلک آرت کو نسلوں کی اہمیت تسلیم، جن میں ایمرغا نوادوں کی صاحبزادیاں درج الوقتی کے لیے جمع ہوتی ہیں اور نمائش ہوتی ہے۔ اور نمائش دیکھنے والیوں کو دیکھنے کے لیے لوگ کشاں کشاں پہنچتے ہیں۔" دروغ بُرگدن انشا، سینیار میں حصہ پئیے والے محققین کا مستقر فیصلہ تھا کہ مسئلہ یہ ہے کہ پچھر کی نعمتیں جو آرت کو نسلوں میں بھی ہوئی ہیں، انھیں عوام تک کیسے پہنچایا جائے۔

مجھے اس فیصلے سے پورا الفاق نہیں۔ یہ درست ہے کہ پچھر کی نعمتیں آرت کو نسلوں میں بھی ہوئی ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کس طرح ان نعمتوں کو پچھر کے صبح دار نہیں یعنی اہل دیہات تک پہنچایا جائے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ کس طرح آرت کو نسلوں کی توجہ نعمتوں سے ہٹا کر کہ پچھر کی طرف مبذول کر لئی جائے۔ کس طرح انھیں "ماڈ" سے ہٹا کر مبذول کا احساس دلایا جائے۔

پُر لئے زمانے میں کسی ملک کو زیرِ اثر لانے کے لیے قریب کشی کی جاتی تھی۔ اسے فتح کر کے کالونی بنالیا جاتا تھا۔ اتنی مصیبت کون کرے؟ آجکل ایک شارٹ کٹ دریافت کر لیا گیا ہے۔ فوجی محاذ کی جگہ پچھر محاذ کھوئی دھ۔ گولیاں چلانے کی بجائے کوک بوتلیں چلا دو۔ حسن کے سنگار کا راز افشا کر دد۔ ٹینک کی جگہ جیسز چلا د۔ منی کو حرکت میں لا د۔ آرت کو شل کو

"ماڑ" بنادو۔ آرٹسٹوں کا رُخ ہالی دُکی طرف پھر دو۔

امقصادی اور سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے الین پلچر نے پاکستان کا حجہ صرف کر کھا ہے۔ جملہ اور خود محاضے میں شامل نہیں۔ اس کی کیا صورت ہے؟ ان کے مقامی ایجنت جو ہیں شہر ہے۔ آرٹ کونسلیں ہیں۔ کالا صاحب ہے۔ آسان ساتو کام ہے۔ بس سی ناکر دیہاتی کلپن کی تفعیل کر دے۔

پھر کالم صاحب کے دل دُب ایں۔ بیور و کریٹ ہے جو عالمیہ انگریزیت کو ادا رہنا بچھونا بنائے بیٹھا ہے۔ بیگم ہے جو حسن کے سینکار کا بھید جانتے کی خاطر میم بی پھرتی ہے۔ گزشتہ ۲۶ برس سے بڑے بڑے دنشور سوچ رہے ہیں کہ ہمارا کلچر کیا ہے؟ بالکل ایسے ہی جیسے فرنگی فلسفی دیہات کی ایک اپکوں بھری کچی دیوار کے سلئے میں بیٹھا سوچ رہا تھا، سوچے جا رہا تھا۔

دیہات کی ایک بی بی نے پوچھا "بیبا، تو کیا سوچ رہا ہے؟" فرنگی فلسفی بولا "سوچ رہا ہوں کہ بھیں دیوار پر کیسے چڑھی؟" بی بی نے حیرت سے فرنگی کی طرف دیکھا۔

فرنگی نے کہا "بھیں نے دیوار پر گور کیسے کیا ہے؟"

دیہات ہنسی۔ بیبا "تو اتنی سی بات پر ہلکاں ہو رہا ہے؟" پھر اس نے گور کا ایک تازہ اپلا بنایا اور زدن سے پھینک کر دیوار پر لگا دیا۔

دانشور دل کی اس سوچ بچار کی نوعیت "بلیں میں کٹوارا شہر میں ڈھنڈو رائے" مصدقہ ہے۔ جی نہیں مانتا کہ دانشور کٹورے کے دجد سے بے خبر ہیں یا اس کی نشان دی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ دیہات کو اہمیت دینا نہیں پڑتا۔ کیونکہ اگر دیہات کو اہمیت دے دی گئی تو ان کے باختیں کیا رہ جائے گا؟

کلچر کو تلاش کرنے کی یہ دوڑ اور دو کو قومی زبان بنانے کی ۲۶ سالہ جدوجہد کے

مترادف ہے۔ ۲۶۔ برس سے کیٹیاں بیٹھی سوچ رہی ہیں کہ کس طرح اُردو کو قومی زبان بنایا جائے؟ تجربہ شاہد ہے کہ جس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کیٹیاں بٹھا دی جائیں، وہ بھی حل نہیں ہوتا، کیونکہ کیٹیاں کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا تو کمیٰ کے وجود کا جائز نہیں رہے گا۔ شہر کے لوگ کلچر کا مسئلہ حل نہیں کریں گے۔ سیدھی بات ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا تو شہر کی اہمیت ختم ہو کر مدد جائے گی۔ شہر کے لوگ میں فی صد ہونے کے باوجود ۸۰ فی صد دیہاتی عوام کے نایابے بننے بیٹھے ہیں۔ شہر کے ساتھ کلچر اور آرٹ کے دہ ادارے بھی ختم ہو جائیں گے جو کلچر کی نایابی کر رہے ہیں۔ مزید براہ اہل زبان کی غلطیت بھی خاک میں مل جائے گی۔ کالے صاحب کے بعد اہل زبان کلچر کے اس کٹورے کے دریافت کرنے سے خوف نہ دہ ہیں۔ اہل زبان کے ہاتھ میں صرف ایک ہتھیار ہے اور وہ ہے زبان جسے وہ تواری طرح چلاتے پر مجبور ہیں۔ کچھ محققین کا کہنا ہے کہ اُردو کو فرنگی نے اس لیے رانچ کیا تاکہ عربی اور فارسی کے اثرات کو رد کیا جائے۔

بہر طور پر حقیقت مسئلہ ہے کہ اُردو ایک درباری زبان ہے جس میں درباری کا رنگ ہے۔ چونکہ درباری ہے اس لیے بات بڑھا چڑھا کر تی ہے۔ نوابوں اور جگیروں کی ترجمان ہے۔ بورڈ ہے۔ چٹ کپڑی ہے۔ لکڑا اور طرہ سجائے بغیر دم نہ کھتا ہے۔ جذبات کا شیرہ اتنا گلاڑھا ہے کہ حقیقت نگاری سے جی چھاتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی جڑیں لوک ریت میں پیوست نہیں۔ کیسے ہیوست ہوں؟ نوابوں کی لوہنی کو لوک سے کیا واسطہ؟ جمیں تو اُردو میں نہ کوئی لوک گیت ہے، نہ لوک کہانی۔ اسی وجہ سے اہل زبان مختلف ہیں کہ اگر کلچر کا مرکز گاؤں قرار دے دیا گیا تو زبان کے ہتھیار کی دھاکہ کند ہو جائے گی اور وہ نہستے ہو کر رہ جائیں گے۔ لہذا امان اسی میں ہے کہ کٹورا بغل میں رہے اور تلاش جاری ہے۔ اب سُننے میں آ رہا ہے کہ حکومت کی خواہش کے مطابق، کلچر کی ایک الگ وزارت بن رہی ہے۔ گھبرا نہیں۔ اس وزارت میں ادب کا کوئی شعبہ نہیں ہو گا۔ اس میں کلچر ہو گا،

آرٹ ہوگا، سائنس ہوگی اور کھیل ہوں گے۔ ادب نہیں ہوگا۔ آرٹ کوئی نے گزشتہ دو سال میں ثابت کر دیا ہے کہ ادب آرٹ نہیں۔ لہذا ادب یادیب سے رابطہ رکھنا کوئی نہیں۔

اپ کہیں گے یہ ادب کی بڑی بد نصیبی ہے کہ اسے دنارتِ کچھ میں کوئی مقام نہ ملے۔
ذ نہ نہ تر۔ ایسی بات نہیں نظرِ فائز سے دیکھیے تو آپ پر جمیں کھل جائے گا کہ اٹھایہ ادب کی خوش قسمتی ہے۔ کیونکہ دنارتِ کچھ شہری کچھ کو تقدیرت دے گی، عجزی آرٹ کو فروغ دے گی اور سچے دیانتی کچھ کے لیے مزید تحریر پیدا کرے گی۔ اگرچہ اس کا نام دنارتِ کچھ ہو گا لیکن کام ان عناصر کو تقدیرت دینا ہوگا جو ہمارے حقیقی کچھ کی یعنی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں: بعزم شکر ہے کہ ادیب اس فریب میں شریک کار رہے ہو گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا وہ کون مجس ہے جو درپرداز ادب اور ادیب کی اعانت کر رہا ہے؟ ہمیں فریب کاری سے بچانے کے لیے کوشش ہے؟

ظاہر ہے کہ وہ کسی دنارت کا اہل کار ہو گا۔ اہل کاروں میں بہت سے اعلیٰ پائے کے ادیب موجود ہیں۔ ان میں بڑی صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن وہ کھل کر سامنے نہیں آتے۔ بیچائے جمیو ہیں۔ اس لیے کہ حکومت ادیبوں کو اپنی لگاہ سے نہیں دیکھتی۔ ہماری حکومت کی ہی بات نہیں، ہر حکومت ادیبوں سے بذریع ہوتی ہے۔ تاریخِ شاہد ہے کہ حکومت اور ادیبوں کی اہمیت سے ان بن رہی ہے کیا پاسی وقت ترنج میں اگر ادیب کیا کہ دے۔ اسی خطرے سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے تو مغلوں نے دربار میں رتن رکھنے کا دراج ڈالا تھا۔ مقدمہ تھا کہ ادیب دربار دار بن جائیں۔

سچ پوچھیے تو سارا قصور میرا اپنا ہے۔ کیونکہ میں اہل کار ادیب کے سامنے بھکنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس بات پہنچا ہے کہ مولانا کوثر نیازی نے مجھ سے مسکرا مسکرا کر بتائیں کی ہیں۔ غیف رام نے ایک بار مجھے فون کیا تھا۔ مسعود غفرنی نے جائے پر بلایا تھا۔ اور مجھے

فخر ہے کہ ممتاز سعود نے میری خاطر ایک اصول توڑا تھا، ایک ادیب سے دفتر میں ملاقات کرتا منظور کیا تھا، دفتر میں ادب پر گفتگو کرنی گواہ کی تھی۔ اور مجھے فخر ہے کہ قدرت اللہ شہاب دوسرے اہل کاروں کے سامنے مجھے کرسی پر بیٹھے رہنے کی اجازت دیتے تھے۔

لہاں، تو میں کہ رہا تھا کہ ادبیوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وزارتِ کلچر میں ادب کا کوئی شعبہ قائم نہیں کیا گیا۔ ورنہ وزارت اس شعبے کو سیکشن افسر کے حوالے کر دیتی اور سیکشن افسر سے آرٹ کونسلوں کے حوالے کر دیتا۔ اور کوئی لیں ادبیوں سے قوایاں کرواتیں اور کلچر کی خدمت کے لیے ہیں زندہ ناج گانا بنادیتیں۔

(یہ مضمون آرٹ کونسل کے سیناڑ میں پڑھا گیا)

اشتار، پی آر اور ادب

اشتار دورِ حاضر کا سب سے بڑا ہمچنیا ہے۔ اشتار نے دراصل میں میڈیا سے جنم لیا۔ میں میڈیا بہت بڑی طاقت ہے، جسے برسراقتنا لوگوں نے ایجاد اور رانج کیا ہے۔ میں میڈیا کا کام عالم کی سوچ کو مخصوص رُخ عطا کرنا ہے، ایسا رُخ جو برسراقتنا لوگوں کے مفادات کے مطابق ہو اور احتیں بڑھاوا دے۔ یہ رُخ ایسے انداز سے عطا کیا جاتا ہے کہ عالم کو شک نہیں پڑتا کہ عطا کر دہ ہے۔ اُٹا دہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنا ہے جو انہوں نے بڑی سوچ بچارے کے بعد اپنا یا ہے۔

مثال کے طور پر میں خود کو ایک سکرپنڈ دانشور سمجھتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ میں ایک سمجھکرو منظر ہوں۔ اخبارات میں میں صرف ”نیوز“ پڑھتا ہوں ”دیلوز“ نہیں پڑھتا، اور حالات کے متعلق اپنی رائے خود قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر بھی میں یقین سے نہیں کہ سکتا کہ میرے نقطہ نظر میں کون کون سا زادیہ عطا کر دہ ہے اور کون کون سا میرا اپنا ہے۔ بڑی بڑی اور بہت سی طائفیں مجھے اپنا زادیہ نقطہ عطا کرنے کے لیے مصروف ہیں۔ گھاس کے ڈھیر سے سچ کی سوئی کون تلاش کرے؟

رُخ عطا کرنے کے کام کی اہمیت اور غلطیت شاید اس مثال سے واضح ہو سکے جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

پڑائی بات ہے۔ چڑیا گھر لندن کے منتظمین نے فیصلہ کیا کہ چڑیا گھر میں ایک برخانی یا پچھڑکا جائے۔ اسے رکھنے کے لیے ایک فراخ کمرا تعمیر کیا گیا۔ ایسی مشینیں لگائی گئیں جو

کمرے میں دہی ٹپر پھر قائم رکھتی تھیں جس میں برفانی یہ کچھ رہتے کا عادی ہوتا ہے۔ کمرے کا فرش غیر ہمارا بنایا گیا تاکہ ٹھلٹتے وقت وہ بیگانگی محسوس نہ کرے۔

انتظامات یکمکمل کرنے کے بعد ایک برفانی یہ کچھ ہتھیا کیا گیا۔ لیکن یہ کچھ اس کمرے میں چند ایک روز ٹھیک ٹھاک رہا۔ پھر ہمارا پڑا گیا اور مر گیا۔ پھر دوسرا یہ کچھ منگوایا گیا۔ دہ بھی چند دنوں کے بعد مر گیا۔

منظریں حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب پڑپتھر مزدوں ہے، کمرا بھی بہت فراخ اور فرش بھی نامہوار ہے، پھر یہ کچھ زندہ کیوں نہیں رہتا؟ انہوں نے پیشیں لوں سے مشورے کیے۔ ان کی بھی یہ مشکل سمجھ میں نہ آیا۔ آخر کسی نے کہا “بھی، اشتہار دد کو خخف اس مسئلے کو حل کرے گا، اُسے انعام دیا جائے گا۔ اتفاق سے وہ اشتہار کسی پبلسٹی ایکسپریٹ کی نگاہ پر چڑھ گیا۔ اس نے جا کر موقع دیکھا۔ پھر نظریں سے ملا۔ کہنے لگا: سیدھی بات ہے۔ یہ کچھ اس کمرے میں ایٹ ہرم محسوس نہیں کرتا۔ اسے یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ برفانی پہاڑوں میں قیم ہے۔ لہذا کسی پینٹر کو بلائیے۔ اس سے کہیے کہ کمرے کی دلیواروں پر برفانی پہاڑوں کی تصویریں پینٹ کر دے۔ اس کے بعد تیسرا یہ کچھ سالہ ماہ سال اسی کمرے میں بخیر و عافیت اور خوش و ختم رہا۔

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی زندگی کی چار دلیاری پر کسی ناکسی ازم کے میڈیا نے ایسی تصویریں پینٹ کر دی ہیں جن کے سامنے وہ خوش و ختم نہیں لبر کر رہے ہیں۔ میڈیا کی طاقت کو محسوس کرنے لے بعد تا جزوں نے اس راز کو پایا کہ اپنی صنعت کو بیچنے کے لیے وہ میڈیا کے اصولوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لہذا انہوں نے اشتہار ایجاد کیا۔

اشتہار آج کے دور میں بے پناہ طاقت حاصل کر چکا ہے۔ مثلاً چائے کی پیشی کے سو ڈگروں نے سوچا کہ اگرچہ چائے ایک گرم مشروب ہے اور اسے گرم ملکوں میں راجح کرنا

دشوار ہے، لیکن گرم حمالک میں رائج کیے بغیر چاہرہ نہیں۔ لہذا عام کی سوچ کو اس اُرخ
دیا جائے کہ ان کے لیے چائے قابل قبول ہو جاتے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب
بیسیں طبیعت یونانی کا دور دورہ تھا۔ عام کسی چیز کو استعمال کرنے سے پہلے سوتھے تھے
کہ چیز کی تاثیر کیا ہے۔ گرم ہے، ٹھنڈی ہے یا معتدل۔ ان دونوں لوگ لستی پینے کے عادی
تھے اور حقیقی امور گرم خشک اشیاء سے ابتنا ب کرتے تھے۔

ان بالوں کو متنظر کر جائے کپنیوں نے جو پہلا اشتہار جاری کیا وہ یہ تھا:
گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔

بطاہرہ ایک عام ساجملہ ہے، لیکن میں اسے ایک عظیم مجدد سمجھتا ہوں۔ اس
مجملے نے خامی کو ایک ایسا رخ بخش دیا کہ وہ خوبی بن گئی۔ اس مجملے کو بار بار دُہرا یا
گیا۔ اتنی بار دُہرا یا گیا کہ اب بھی جب کبھی شدت کی گردی پڑتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے
کہ ایک پیالہ چائے کاپی کر گرمی کے ڈنک سے بخات حاصل کروں۔

اشتہار اخبارات، رسیڈیو اور فی وی تک محدود نہیں ہوتا۔ کئی ایک اشتہارات
فضایں چھوڑ دیے جاتے ہیں، جس طرح ویگنیوں کے الگ اسٹ دھوں فضایں چھوڑتے ہیں۔
کئی ایک اشتہارات زیر لبی کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر تقسیم سے پہلے جب جاپان نے اپنے کل پُندزے نکالے تراخوں نے
یہ دتیرہ اختیار کیا کہ ولادیت کی ہر نئی ایجاد کی نقل کر کے اسے کوئی قیمت پر منڈی میں
پہنچانے لگے۔ اس پر ولادیت کے لوگ گھبرا گئے۔ گھبرا سٹ کی بات تو تھی، کیوں کہ منڈی
باختہ سے نکلی جا رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے جاپان کی مصنوعات کی تذليل کے لیے ایک
زیر لبی چلا رکھ کر جاپانی ہے۔ مطلب تھا کہ ناقابل اعتبار ہے، سرسری ہے، دیر پاہن۔
یہ زیر لبی اشتہار سرگوشیوں میں چلا اور پھر اس قدر عام ہو گیا کہ لوگ علاویہ کرنے
لگے ”ہٹاؤ یار، جاپانی ہے“۔ پہلے چیزیں جاپانی ہوئیں، پھر خیالات جاپانی ہوئے۔ پھر

افراد کے متعلق کہا جانے لگا کہ جاپانی ہے۔ یعنی جاپانی کا مفہوم صنعتی سمجھا جانے لگا۔ اگر جاپانی قوم اس قدر ضدی، ہست دھرم اور عقینی نہ ہوتی تو اس زیرِ بحی اشتہار سے بچ دیکھتی تھی۔ تحقیر کی اس دھار سے جاہنربن ہو سکتی تھی۔ لیکن جاپانیوں کا جواب نہیں۔ اتنے بڑے دارکونا کارہ کر دیا۔ اور دیکھیے آج صنعتی میدان میں جاپانی کس مقام پر فائز ہیں۔ انگریز نے ہندیوں کی تحقیر کے لیے باجوہ کا لفظ فضایں چلایا۔ یا الجدر اصل "بیرون" کا مخفف ہے۔ بیرون کا مطلب بذر ہے۔ اور طلا خطر ہو کہ ہم آج بھی باجوہ کھوانے پر غریب محسوس کرتے ہیں۔ میں میدیا کے اس اشتہاری جوہر کی حرمت انگریز تائیر کو دیکھ کر پڑھے لکھے سمجھ دار لوگوں نے اسے برنا شروع کر دیا۔ مثلاً دفتر والوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ کام کرنا اور بات ہے، کام کرتے ہوئے نظر آنا اور بات۔ یعنی کام کرنا اہم نہیں، کام کرتے ہوئے نظر آنا اہم ہے۔ کامی ہونا اہم نہیں، کامی ہونے کا تاثر در نیا اہم ہے۔ لہذا انھوں نے دفتر کے کاریڈور میں یہی چلن پھرنا شروع کر دیا جیسے شدت سے مصروف ہوں۔ اور چھٹی کے بعد اپنی میز پر نائلیں یوں پھیلانا شروع کر دیں کہ بڑے صاحب گزرتے ہوئے دیکھیں تو مجھیں کہ کام میں اس قدر شدت سے مصروف ہے کہ تباہی نہیں چلا کہ دفتر بند ہو چکا ہے۔ یہ بھی اشتہار کا ایک اندان ہے۔

یوں لوگوں کو اپنی ذات کے متعلق اشتہار دینے کی عادت پڑی۔ اس روشن نے دوسرے لوگوں کو بھی متاثر کیا۔ مثلاً ادیب، شاعر اور فن کار۔ بلکہ یوں کہا چاہیے کہ ادیب اس روشن سے کچھ نیادہ ہی متاثر ہوئے، کیونکہ ادیب عام لوگوں کی نسبت نیادہ حساس ہوتے ہیں۔

پہلے نہ نہیں میں لکھنے والے بہت خوش قسمت ہوا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۶ء میں جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو پنجاب کا ادبی میدان خالی پڑا تھا۔ چار ایک لکھنے والے تھے۔ کمپی ٹیشن کی کوئی صورت نہ تھی۔ میری سہلی کہانی ادبی دنیا میں پھی مخصوصاً احمد

نے وہ کہانی ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ ساننا میں میں چھاپی۔ پہلی ہی کوشش پر میں جانا پچھانا اور ایب بن گیا۔ نہ ہی یہ لگی نہ پھیلکر گئی۔ حالانکہ میں اردو زبان سے قطعی ناداعفت تھا، اور ادب بننے کی نہ تھہ آرزو دھتی تھے اُمید۔ کیونکہ سپلی کہانی بھی میں نے از خود نہیں لکھی تھی۔ مجھے لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس دور کے لکھنے والے بڑے خوش قسمت تھے۔ آج تک کے لکھنے والے بڑے بدلتے ہیں۔ لکھنے والوں پر ہے۔ بھیر ہبنت زیادہ ہے۔ مونڈ سے اسے بغیر راستہ بنانا دشوار ہے۔ لہذا مندرجہ حالتاً پڑتا ہے۔

آگے نکلنے کا جذبہ قدرتی بات ہے۔ اس مقصد کو پانے کے لیے کئی ایک طریقے رائج ہیں۔

سب سے بڑی مشکل تر پڑنے لکھنے والے ہیں جو اگلی صفحوں میں دھرم نامے پڑھتے ہیں۔ جب تک انھیں ہٹایا نہ جاتے، بات کیسے بنے۔ انفرادی طور پر ایک ایک پڑانے کو ہٹانا تو خاص مشکل اور دبایا کام ہے۔ اس یہ سمجھدار لوگ حکمتِ علی کو کام میں لاتے ہیں۔ لہذا ایک زیر بھی چلا دی کہ پڑانا ایب بوسیدہ ہے، ابے کار ہے۔ دورِ جدید کے نئے خیالات، نئی حیات اور نئے اشارات کا احتاط نہیں کر سکتا۔ لہذا حمل ہے۔ تیجھی یہ ہو اکہ داقعانی کہانی روکر دی گئی اور تحریر دی کہانی نے اہمیت حاصل کر لی۔ پلا پڑانے کلہاٹوں سے لنجات می۔

نئی کہانی میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ وہ نئی ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ جو نئی ہوگی، اس میں تازیگی ہوگی۔ تیسرا خوبی یہ ہے کہ چاہے مضموم ہو یا نہ ہو، کوشش بہت ہوتی ہے۔ مضموم نہ ہو تو کوشش اور بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ قاری کو تحقیق پر اُبھارتی ہے، ذہنوں میں پُراسارا حل پیدا کرتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اہم کو ہتھیار کے طور پر برستی ہے۔ بات کہ بھی درستی ہے، نہیں بھی کہتی۔ مصافت کو ذاتے داری کے

بھجھٹ سے بچائے رکھتی ہے۔ بہر حال، نیا پن بہت بڑا اشتہار بن جاتا ہے۔ دیسے بھی ہمارے نئے لکھنے والے زیادہ ذہین ہیں۔ زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ زود حس ہیں۔ اشتہار کی غصہت سے داقف ہیں۔

پلیے، نئے افسانے کے زور پر پڑانے لکھنے والے تو راستے سے بہٹ گئے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ نئے لکھنے والے دھڑا دھر دھر میدان میں آ رہے ہیں۔ اب اس مشکل سے کیسے پٹا جائے؟ نئے لکھنے والوں نے اس مشکل کا علاج یہ سوچا ہے کہ گروپنگ کرو، اور من تُ راحابی بگویم تو مر راحابی بگو کے اشتہار کو کام میں لاؤ۔

نتیجہ یہ ہے کہ سر جھلے میں ایک ادبی انجمن قائم ہو گئی ہے، جس کا کام ساختیوں کو اچھانا اور مخالفین کو گرانا ہے۔ جگہ جگہ ادبی انجمنیں قائم ہو جانے کی وجہ سے ای بیوں کی ایک خوبی جاعت پیدا ہو گئی ہے، جو کچھ تحریک نہیں کرتی، صرف مخفہ زبانی تقدیم کے بل برتے پر نام پیدا کرتی ہے۔ یہ لوگ ادبی اجلاس میں عالمانہ اور دانشوارانہ منگ میں باقی رکنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ سیدھی بات ہے، اگر آپ مخفہ زبانی گفتگو سے مشترک عمل کر سکتے ہیں تو پھر تحریک کے بھجھٹ میں کیوں پڑیں۔ خواخواہ درد زدہ مول لینا دانشمندی نہیں پڑائے نہ مانے میں ادب میں گروپنگ کی بُنیاد ترقی پسندوں نے ڈالی۔ یہ ایک منظم تحریک ہے جس کی پُشت پناہی ایک گپ پادر کر رہی تھی۔ انھوں نے اپنے سلک کو دُنیا بھر میں پھیلانے کے لیے ادب کو ایک ذریعہ بنایا تھا اور اس تحریک کا ایسا نام رکھا تھا جو بذاتِ خود ایک اشتہار تھا۔ میری دانست میں اس سے بڑا اشتہار آج تک تشكیل نہیں دیا جاسکا۔ کون ہے جو خود کو ترقی پسند کرنا یا کہلوانا نہیں چاہے گا؟

لیکن پڑانے نہ نکلے کی یہ گروپنگ ایک زاویہ نظر، ایک سلک پر قائم ہوئی تھی۔ آج کل کی گروپنگ زاویہ نظر یا سلک کی محتاج نہیں۔

دلیسے گروپنگ بڑی لاجواب چیز ہے۔ ایک بار اس کی لٹ پر جائے تو بھر جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر ترقی پسندی کے زمانے میں کچھ ایسے ادیب بھی تھے جو اس تحریک سے الگ رہے ترقی پسندوں کو گوارہ نہ تھا کہ کوئی الگ رہے۔ جو الگ رہتے تھے انہیں ترقی پسندی میں کا حق دینے کے قابل نہ تھے۔ لہذا اس دور میں غیر ترقی پسندوں کی بڑی ٹائی ہجومی۔ اس پر کچھ لوگ خظیماً القسم کے خیال سے مل بیٹھے۔ یون ایک گروپ قائم ہو گیا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ ترقی پسندی کے انحطاط کے بعد یہ گروپ ختم ہو جاتا کیونکہ خطرہ مل چکا تھا، تحفظ کی ضرورت نہ ہی تھی، لیکن گروپ کے سرما ہوں کو لیڈر شپ کی جانب لگ گئی تھی۔ لہذا یہ گروپ آج بھی قائم و راثم ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو متمول ہونے کی حیثیت سے ادب کو ذاتی اشناز کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے ادبی انجمنیں بنارکھی ہیں۔ بڑے بڑے ہو ٹوں ہیں جسے کیے جلتے ہیں۔ چائے پیسٹری کے دور چلتے ہیں۔ بڑے بڑے دزیوں اور بالکاروں کو مد نوکیا جاتا ہے۔ ادبیوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ جسے میں اپنے اپنے مضامین پڑھیں۔ اس پر ادیب فخر سے پھوپھو ہیں سمانتے۔ اس طریقہ کا رکوپی آرکتے ہیں۔ بہر طور پر جدید میں یہ رجمان چل نکلا ہے کہ تخلیق کی سر دردی کے بغیر ادبی حلقوں میں شہرت اور اہمیت حاصل کی جائے۔ کچھ لوگ اس رجمان پر متعارض ہیں۔ لیکن میری دانست میں یہ اعتراض جائز نہیں۔ اس لیے کہ اشناز دیرِ حاضر کا امتیازی نشان ہے، اور نئے ادبیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ دیرِ جدید کے نئے نہ جوانات کو اپنائیں اور ان سے مستفید ہوں۔

سانس اور ادب

سانس کے تین پہلو ہیں:

(۱) سانس علم ہے۔ اس کے والے سے ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔

(۲) سانس ملکنا لبھی ہے۔ یعنی ایسا علم جسے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اس کے کافی پہلو کی چیزیت اس قدر اہم اور فعال ہو جکی ہے کہ علم کی چیزیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔ یعنی سانس نے مشین ایجاد کی اور صاحب چیزیت لوگ اسے برتر رہے ہیں، اور سانس ایسی ایجادات کرنے پر بجود رکھ دی گئی ہے جو صاحب چیزیت لوگ اپنے مفاد کے لیے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ اس چیزیت سے سانس ایک جن ہے جو الادیزوں کے لئے پڑھی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے سانس ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

(۳) سانس ایک روایت ہے، ایک ذہنی رُخ ہے، ایک ایٹھی ٹیوڈ ہے جو آج کے پڑھے کھے لوگوں اور دانشوروں، یعنی آپ اور میں، ہم سب کے ذہنوں پر پھایا ہو رہے ہے۔ یہ روایت جسے ہم بڑے فخر سے سینے پر تنخ کی طرح سجائے چھرتے ہیں غلط ہے، جھوٹ ہے، مگر اکن ہے، جہالت پر مبنی ہے۔

صاجبو! یہ میں نہیں کہ رہا۔ میری کوئی چیزیت نہیں کہ اتنی بڑی بات زبان پر لا لاؤ۔ یہ بات جدید ترین سانس دان خود کہ رہے ہیں۔

ویسے تو کتابی لوگ رسی طور پر یہ کہنے کے عادی ہیں کہ ہر علم کے، جسے کام میں لایا جاسکتا ہے، دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک خیر کا، دوسرا شر کا۔ لیکن یہ بات کہنے کی بات یہ مضمون قلم قبیلہ کے سینیار میں پڑھا گیا۔

ہے۔ ہم ایسی تکنیکی میٹھی باتیں کر کے خود کو خوش رکھنے کے عادی ہیں۔ بہ طورِ حقیقت کو جھپٹلایا نہیں جاسکت کہ ہمیشہ ہر درمیں صاحبِ تفہیق لوگ علم کو بر تھے رہے ہیں۔ آج کے دور میں یہ لوگ کھل کر سامنے آئے گئے ہیں۔ ایک با اقتدار طبقہ، دوسرا سرمایہ دار طبقہ۔

با اقتدار طبقہ نے سائنسی علوم کو اسلامی سازی کے لیے برتا۔ برت رہے ہیں سرمایہ داروں نے منافع خوری کے لیے برتا۔ برت رہے ہیں۔ اگرچہ چلتے اتفاق سے خلائقِ خدا کی خدمت بھی ہو گئی تو یہ ایک صفائی بات ہے۔

سائنسی علوم کے بر تے جانتے کا پبلواس صد تک اہم ہو گیا ہے کہ اسے علم کہنا میری دانست میں علم کے لفظ کی توبیں ہے۔ سائنس بیچاری اب چاکر بن گئی ہے اور سائنس دان مظلوم۔ یادہ بکھر لگے ہیں یا انھیں اخواز کر لیا جاتا ہے۔ طویل غلامی ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اقتدار پسندوں اور سرمایہ داروں کی ہوس کی تسلیں کریں۔

صا ججو! اگرچہ لطیف ہے لیکن حق ہے۔

ایک صاحب نے پوچھا: ایٹھی ٹیکنا لو جی میں رومنے زیادہ ترقی کی ہے یا امریکا نے؟ دوسرے جواب دیا: میرے خیال میں جو جمن انجینئر رومنے کے تحت کام کر رہے ہیں وہ اتنے قابل نہیں جتنے وہ جمن انجلیش، جواہریکا کے تحت کام کر رہے ہیں۔

جنابِ والا! یہ آج کے بڑے، بڑے کھلاتے ہیں، طاقت کے زور پر بڑے ہیں۔ بے شک ہمیں ان کی ہے لیکن انھیں بڑا بنانا نہیں آیا۔ ہمارے لیے بڑے کا مفہوم کچھ اور ہے۔ میں ایک بڑے کو بانتا ہوں۔ اسے بڑا مانتا ہوں۔ اس کا عہدہ اتنا اُونچا تھا کہ آج تک کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود وہ خود کو کسی سے پر تنہیں بھتھتا تھا۔ کسی کو خود سے کم تر نہیں بھتھتا تھا۔ بڑا ہو کر بڑا نہیں بنتا تھا۔ میں صرف اس شخص کو بڑا مانتا ہوں جو اس بڑے کے نقش قدم پر چلے۔

اب یعنی سائنسی رویتے کی بات۔ میرے موصوع کا سائنس یا ٹیکنا لو جی سے اتنا

تعلق نہیں جتنا سائنسی روایتے ہے، اور جس نے آپ کا میراہم سب دانشوروں کا ستیاناں کر کھلہ ہے۔ اس سائنسی روایتے سے مجھے سب سے پہلے برٹنیڈرسل نے دو شناس کیا۔ کہنے لگا: دوستو، شک کردو۔ ہر بات پرشک کرنا سیکھو۔ شک کے بغیر تم سچائی کو نہیں پاسکتے۔ شک کی تلقین کر کے اس نے مجھے مذہب سے کاٹ دیا۔ روایات سے کاٹ دیا۔ لوک داش سے کاٹ دیا۔ یوں محظ پر سائنسیں گل ٹیکڑا کا پاٹ چڑھ گیا۔ اس وقت یہ خیال نہ آیا کہ مجھے سائنسی روایتے پر بھی شک کرنا چاہیے۔ آج بھی ہماسے دانشور اسی سائنسی اور عقلی روایتے کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ روایتے اُنسیوں صدی کی سائنس کی پیداوار ہے۔

بسیوں صدی میں سائنس کی کایا پیدا ہو گئی۔ پُرانی لکھی اُتریگئی۔ جس طرح سُورج غرِدب ہونے کے بعد بھی ۱۲ منٹ تک ہم اس کی روشنی دیکھتے رہتے ہیں، اسی طرح ہم اُنسیوں صدی کی سائنس کی روشنی میں جی رہے ہیں۔ خود کو داش درجھ کر منکھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں تین بڑے اہم اکتشافات ہوتے۔ ہم نے ان اکتشافات کوئُنا، جانا، گرمانا نہیں۔ مان لیتے تو ہمیں اپنی "بیلیٹ" کی پرانی حریقی ڈھا کرنی تعمیر کرنی پڑتی۔ اس لیے ہم نے اپنی آسائش کے لیے نیس کی طرح اندری آنکھ پر فوری بن لگائی اور کہا کہ سامنے کوئی نئی بات موجود نہیں میگن بیٹھے رہو۔ جب حشر کا دن آئے گا، اس روز دیکھا جائے گا۔ پہلا اکتشاف یہ ہجوا کر مادہ اور رُوح دو اگلے چیزوں نہیں بلکہ ایک ہی ٹھنی کے درپتے ہیں۔ ہم نے دونوں کو اگلے الگ ڈببوں میں بند کر رکھا تھا۔ سائنس کو پتہ چلا کر مادہ صرف مادہ ہی نہیں بلکہ بیک وقت مادہ بھی ہے، انرجی بھی۔ بیک وقت جامد بھی ہے، متحرک بھی۔ اور وہ طرح طرح کے روپ بدل سکتا ہے۔ اس بات تے فریکس کی بیشاد ہی بلادی۔ ساتھے ہے چاری منطق بھی پٹ گئی کہ کوئی چیز ایک وقت میں یا تو افت ہو سکتی ہے یا ب۔ بیک وقت افت یا ب نہیں ہو سکتی۔ یہ ضروفتہ غلط نکلا۔ یعنی دلیل

کی کمرٹوٹ گئی۔ چھپر فزکس پر یہ انکشافت ہوا کہ جلی منزروں کے اصول سائنس کی اور پکی منزروں پر بینخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ کبھی تردشی سیئی لیکر پر جلوتی ہے اور کبھی سائب کی طرح بل کھانے لگتی ہے۔ پہلے ہی اس طور نے پتا نہیں کس خوش فہمی کے نیزرا شاعلان کر دیا تھا کہ انسان ریشن انسیں ہے۔ کچھ سیدب کو زخم ہو گیا کہ میں پکا ہوا ہوں، لہذا اسی خوشی میں وہ ڈال سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔

اس بھلے آدمی کا مطلب یہ تھا کہ انسان میں ریشن ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ چاہے تو اس صلاحیت کو برداشت کر سکتے ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ انسان اس صلاحیت کو برداشت نہیں چاہتا۔

صاجبو! ہم ریشن نہیں۔ ریشنلائزگرنے کے شوق میں مقصد کی گاڑی کو چلانے کے لیے عقل کا گھوڑا آگے نہیں بلکہ گاڑی کے پیچھے جوتے ہیں۔ دینے ہوں تو دو اور دو تین گنے ہیں۔ لینے ہوں تو پارچ۔

انسان کی سب سے امتیازی خصوصیت عقل نہیں، جذبہ ہے۔ کتابی لوگ کہیں گے جذبات اچھے بھی ہوتے ہیں، بُرے بھی ہوتے ہیں۔ بے شک بُرے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اچھے جذبات کی فراوانی ہے۔ بُرے آٹے میں نک کی مصلاق ہیں۔ بے شک ذائقہ نک کا عادی رہتا ہے لیکن آٹے کی فراوانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میرا ایمان ہے انسان کے خیر میں جب شر خیر پر عادی ہو جائے گا تو زندگی کا دھارا سوکھ جائے گا۔ لہاں تو، میں مادے کا ذکر کر رہا تھا۔ بیسویں صدی میں مادے کے متعدد نئی بالوں کا پتا چلا۔ پہلے ہم سمجھتے تھے مادہ جتنا بھی ہے، اتنا ہی رہے گا۔ زدہ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ پتا چلا کہ یہ غلط ہے۔ مادہ آتا ہے۔ پتا نہیں کہاں سے آتا ہے۔ اذکر کے طریقوں سے آتا ہے۔ جھٹی کہ مادے کی بارش بھی ہوتی ہے۔ خنقری کہ فزکس میں یہ کتنا ناممکن ہو گیا کہ نہ لالاں عمل عملکن ہے، نہ لالاں ناممکن۔ یا نہ لالاں اصول اٹل ہے۔ یعنی بے جا سق

فرزس کا پھلکا اڑ گیا۔
دوسرائیں دقت کے متعلق تھا۔

ہم سمجھتے تھے کہ دقت آتی ہے، جاتا ہے۔ پتا چلا کہ نہ آتی ہے نہ جاتا ہے۔ دقت ایک اٹلی اور دوائی چیز ہے، ماضی، حال، مستقبل اس کے تین روپ ہیں جو جانشی شوونے ایجاد کر رکھے ہیں۔ آئنے طاثن کے چیلے اب حال کے سوا کسی روپ کے تسلیم نہیں کرتے۔ یہی بات صوفی کہا کرتے تھے اور ہم ان پر ہنسا کرتے تھے۔

اگر دقت ایک زندہ اور پاینده چیز ہے تو ”پری کالینیش“ یعنی کشف ایک سائنسی حقیقت ہے۔ اب لوح و قلم سے انکار کون کرے۔ پھر شور کی عقلت مسلم ہو گئی۔ تمام ”آکلٹ“ سائنسوں کو جن پر فرزس کی ہنسا کرتی تھی، عزت کا مقام حاصل ہو گیا۔ سپری پچھل کا لفظ بے معنی ہو کر رہ گیا۔ کیوں کہ ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ ہمارا پچھل کا کام پیٹ غلط ہے، محدود ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے شعور کی اہمیت سامنے آگئی۔ اندر کا انسان اتنا ہری اہم ہو گیا جتنا باہر کا انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس ضمن میں اپ کو ایک دلچسپ واقعہ سُنا تا ہوں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب سائنس انسیوں صدی کا چشمہ لگائے بیٹھی تھی۔ آکلٹ سائنسر کو نہیں مانتی تھی۔ اُن دنوں ای ایس پی نے ٹیلی پیچھی کا شور مچا رکھا تھا۔ فرزس اس پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ کوئی سائنس دان ایسا نہ تھا جو ٹیلی پیچھی کو آزمانے کے لیے تیار ہو۔

دفعتہ روسی فوج کو سوچی کر ٹیلی پیچھی کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ جب فوجی کیونکیش کے دوسرے ذرا لاغ فیل ہو جائیں تو کیوں نہ اسے آزمایا جائے۔ آزمانے کے لیے دیسختم کے تجربات کیے گئے۔ کچھ کچھ ٹھیک پایا تو بولے: ہاں، کام لایا جا سکتا ہے۔ ٹیلی پیچھی کو بحیثیت علم نہیں مانا۔ بحیثیت کام کی چیز مان لیا۔ آج کا روسی تحقیقی سلیط جو پارا سائیکلو جی پر تجربات کر رہا ہے، اسے علم کی بحیثیت نہیں دے رہا بلکہ بھیاری کی بحیثیت

دے رہا ہے۔ لہذا تحقیق کے نتائج کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ صرف پاراسائیکالوجی کی بات نہیں، سائنس کی جدید ترین دریافتوں کو بھی خفیہ رکھا جا رہا ہے۔ اس کی دو وجہات ہیں:

- ۱۔ ہتھیار کار انڈمن تک نہ پہنچے۔

- ۲۔ نئی دریافتیں عوام کے دلوں پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ اگر عوام کو پتا چل گی تو روایتے بدلت جائیں گے۔ ذہنوں کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ مذہب مفرد ضرکی حیثیت سے نکل کر حقیقت بن جائے گا۔ روحاںی دُنیا کی اہمیت برطحہ جائے گی۔ خارجی دُنیا کی حیثیت کم ہو جائے گی۔ عقل و دلیل دُم دبا کر بیٹھ جائیں گے، اور اللہ میاں برسراہم گرسی پر براجمن ہو جائیں گے۔

بیسویں صدی میں جو تیسرا انکشافت ہوا وہ اہم ترین تھا کہ ہم انسانی ذہن کے صرف دسویں حصتے سے کام لے رہے ہیں۔ دس میں سے نو صلاتیں خواہید پڑی ہیں۔ اس بات کا پتا لگانا اذیں ضروری ہو گیا کہ انسان میں کسی کیسی قسم پہنچا ہیں۔ سائنسدانوں کا رُخ خارجی حالت سے ہٹ کر داخلی کیفیتوں پر مرکوز ہو گیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ دروازے کھلنے والے ہیں۔ پردے اٹھنے والے ہیں۔ سائنس کا زاویہ نظر بدل گیا ہے۔ نئے علوم سامنے آئیں گے۔ نئی طاقتیں کا ظور ہو گا۔

دُقت یہ ہے کہ سائنس والوں کا بس نہیں چلتا۔ انہیں علم کی تلاش سے بعکا جا رہا ہے۔ صاعِب اقتدار ان کی آنذاذان تحقیق میں مزاحم ہیں۔ یہ با حیثیت لوگ اور اقتدار پسند ملکوں کے سربراہ نہیں ہیں۔ یہ لوگ سرباز ہوں کی کریں گے اور میں بیٹھے ہیں۔ بھل کر سامنے نہیں آتے۔ مثلاً مشہور زمانہ ہے کہ انگلستان پر یونکروں کی حکومت ہے۔ امریکا پر یہودی کار خانہ دار قابلیں ہیں۔ فرانش پر فرانسیسز کی اجارہ داری ہے۔ اس یہ ہم، آپ اور میں اندر ہیں ہیں۔ اور جہاں تک ان کا بس چلتا ہے اندر ہیں رہیں گے۔ ہمارا ذہنی روایتہ دہی اُتسیسویں صدی والا رہے گا اور خود کو دانشور سمجھ کر موپنچہ مردڑتے رہیں گے۔ تو صاحبو!

یہ ہے آج کی سائنسی دنیا کی صورت حال۔ میں نے اسے خاصی وضاحت سے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم ادب کی ضرورت کا جائزہ لے سکیں۔ سائنسی صورت حال کے متعلق مندرجہ ذیل نکات قابل توجیہ ہیں :

- ۱۔ آج کے پڑھے لکھے لوگوں اور ادیبوں کو جدید سائنس کے رجحانات کا شعور نہیں۔
- ۲۔ ہمارا ذہنی روتے قدر سائنس کی بنیادوں پر قائم ہے جو بیشتر غلط ثابت ہو چکی ہیں۔
- ۳۔ صاحبِ اقتدار لوگ جو میں یا کو کنٹرول کر رہے ہیں، نہیں چاہتے کہ عوام کو جدید سائنس کے رجحانات کا علم ہو۔
- ۴۔ سائنس دان خود زبان یند ہیں۔ اب یہی ادب کی بات۔

میں ادب کے مفہوم کی وضاحت نہیں کروں گا۔ کیونکہ نہ تو میں محقق ہوں نہ نقاد۔ الحمد للہ کہ نقاد نہیں ہوں۔ الحمد للہ کہ عالم نہیں ہوں۔ نکتہ دان نہیں ہوں۔ نکتہ چیزیں نہیں ہوں۔ قلم قبیلے کا ایک عام تخلیق کارہوں۔ سائنس کے متعلق جو گزارشات میں نے پیش کیں وہ میری نہیں بلکہ مستند انسانوں کے بیانات سے انداز کی گئی ہیں۔ ادب کے متعلق جو گزارشات پیش کروں گا وہ میرے ذاتی تاثرات ہیں۔ آپ انھیں نہیں یا نہ مانیں۔ آپ کی مرضی۔ اب سوال یہ ہے کہ سائنس اور ادب میں کیا فرق ہے؟

- ۱۔ سائنس عقل کی بات کرتی ہے۔ ادب جذبات کی بات کرتا ہے۔
- ۲۔ سائنس اصولوں کی بات کرتی ہے۔ ادب انسانوں کی بات کرتا ہے۔
- ۳۔ سائنس کا کام قرتوں کو زیر کرنا ہے۔ ادب کا کام انسان کو انسان کے قریب تر لانہ ہے۔

- ۷۔ سائنس کی اپیل ذہن پر ہے، ادب کی دل پر۔
- ۸۔ سائنس باہر کے انسان سے تعلق رکھتی ہے۔ ادب اندر کے انسان سے تعلق رکھتا ہے۔

آپ کو علم ہے کہ ہر فرد ایک جزیرہ ہے۔ دوسرے فرد سے دور۔ درمیان میں بندہ حائل ہے۔ ہر فرد کے اپنے مسائل ہیں، اپنی مشکلات ہیں، اپنی بجوریاں ہیں، جسے دوسرافر د نہیں جانتا، نہیں بھتتا۔ افراد میں صرف ایک جزیرہ ساختی ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب خالی خمسہ میں مقید ہیں۔ وقت یہ ہے کہ یہ خالی خمسہ بھی ایک جیسے نہیں۔ کچھ لوگ زیادہ دیکھتے ہیں، کچھ زیادہ سُنتے ہیں۔ مثلاً میں اپنے بیٹے عکسی کی نسبت کم سُنتا ہوں۔ اپنے دوست اشغال احمد کی نسبت کم دیکھتا ہوں۔ قدرت اللہ شہاب کی نسبت کم دیکھتا اور کم سُنتا ہوں۔ اپنی سیلی بالوں قدیمہ کی نسبت کم حسوں کرتا ہوں۔

میری دانست میں ادب کا مقصد یہ ہے کہ ان جزیروں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ فرد کے جذبات اور احساسات کا دوسروں کو شور دلایا جائے۔ دلوں میں ہمیشوریاں پیدا کی جائیں۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے خلاف غم و غصہ بھرا کایا جائے۔ لوگوں کو کمٹنٹ پر بجور کیا جائے۔

میری دانست میں ادیب کی کمٹنٹ بنی نوعِ انسان سے ہے۔ جس طرح حضور ﷺ کی کمٹنٹ بنی نوعِ انسان پر رحمت بھی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ رب المسلمين نہیں رب العالمین ہے۔

بیردنی طاقتوں کی ہیئت سے یہ کوشش رہی ہے کہ جس طرح وہ سائنس کو کام میں لارہے ہیں، اسی طرح ادب اور ادبیوں کو کام میں لائیں لیکن یوں کہ احساس نہ ہو کہ انہیں کام میں لایا جا رہا ہے بلکہ وہ اس خوش فہمی میں بستارہ ہیں کہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے مطلب کے خیالات کا گڑھ ہمارے ہاں بھیجتے رہتے

ہیں تاکہ ادبی لکھیاں اس پرچینجنائیں اور ”اوپنیں میکرز“ کی جیشیت سے یہ گڑ جگہ جگہ
چھیلائیں تاکہ بیردنی طاقتیوں کے مقابلات کا پرچار ہتنا رہے۔

نقیم سے پہلے بدشی اقتدار پسندوں نے ایک بہت بڑی ادبی تحریک چلائی تھی،
جو بہت کامیاب ہوئی اور جس میں ہماسے کئی ایک نامور ادیب شامل ہوئے۔ کچھ اخبارے
میں کانٹے پر لگ کر، کچھ نیشن کی مقبولیت کے لیے شامل ہو گئے۔ کچھ چودھری بننے کے
چاروں ادبی تحریک کا نام ترقی پسند ادب تھا۔ اس ادبی تحریک کا سائزوں کیونسٹ پارٹی کے
ہاتھ میں تھا۔ ادبیوں سے کام لیا جاتا تھا لیکن خصوصی مقاصد سے بے بہرا رکھا جاتا تھا۔
پاکستان بننے پر ہند کی کیونسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ پاکستان اور ہند کے ترقی پسند
ادیبوں کا مرکز ہند ہی میں رہے گا جہاں سے وہ دونوں کو کنٹرول کریں گے۔ یہ بات پاکستان
ادیبوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔ اگرچہ چودھری اسٹ کا شوق تھا لیکن دل میں پاکستان کا
جذبہ بھی تھا۔ لہذا چھوٹ پڑھنی اور یہاں یہ تحریک ختم ہو گئی۔ لیکن آج کل ہمارے ادیب
آن جانے میں پھر سے ترقی پسندی کو سدادے رہے ہیں۔ اُنکچھوں انہم کی وبا فراش سے آئی
اور آج کل بھی زوروں پر ہے۔ مجھے واضح طور پر علم نہیں کہ ان کے کیا مقاصد ہیں۔ لیکن نتائج
سے ظاہر ہے کہ:

- ۱۔ ادب کی توجہ مذہبات سے ہٹا کر ذہن کی طرف مکوز کر دی جائے۔
- ۲۔ ادب کو دانشور بنانا کر عوام سے کاث دیا جائے۔
- ۳۔ ادیب کو اسلام سے کاث دیا جائے۔ اس کے ذہن میں منہسب اور روایت
کے لیے تحقیر پیدا کی جائے۔

پتا نہیں اہل مغرب اسلام سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔ یورپ میں کئی ایک
ایسی انجمنیں کام کر رہی ہیں جن کا واحد مقصد اسلام دشمنی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں جب یہی صدر مقرر
میں طازم تھا تو مجھے سبھی مرتبہ معلوم ہوا کہ یورپ میں ایسی ۱۲۶ انجمنیں باقاعدہ کام کر رہی ہیں۔

یہ تو خیر جملہ معمت صفت تھا۔ آج بھی ہمارے کچھ نوجوان ادیبوں میں اٹلکھوں بننے کا شوق عام ہے۔ وہ خود کر خواص سمجھتے ہیں۔ نزدیک کی کوڑی لانا اپنی توبیں سمجھتے ہیں۔ اور پچھی اپنی باتیں کرنے کے مشائق ہیں جو عالم کی سمجھیں نہ آئیں، اور وہ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

صارجوں! پچھی بات یہ ہے کہ ہم تو کچھ بھی نہیں۔ ادیب دراصل وہ علاقائی صوفیائے کرام تھے جن کی تصنیفات صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی عالم کے دلوں پر قش ہیں۔ ممکنہ زبانی حفظ ہیں۔ میں نے بھی زندگی میں کتابیں لکھیں جن میں دانشورانہ باتیں کیں، نہ عالم نے مخفہ لکھا ہے۔ نقادوں نے گھاس ڈالی۔ پھر اتفاق سے ایک عوامی کتاب "بیک" لکھی۔ میں یہ ران رہ گیا۔ مجھے عالم لوگوں کے تقریباً دعہزار خطوط موصول ہوئے۔ ہر کسی نے کہا: مفتی، تو نے میرے دل کی بات کہ دی۔ میں نے ہپلی بار محسوس کیا کہ میں ایک کتاب لکھی ہے۔ خوشی سے دل باغ باغ ہو گیا۔ پھر دفعہ مجھ پر سات آٹھ بجے گرسے۔ ساری خوشی ہرن ہو گئی۔ یہ علماء کے خط تھے۔ وہ وہ ڈانت پڑی کہ خون خشک ہو گیا۔ ابے اوبے ادب، گستاخ، نماہجوار لیکن پھوٹے ہے۔ پھر سے تلحیز یاد تازہ کرنے کا فائدہ؟ بڑی مشکل سے انھیں بھلایا ہے۔

آئیتے، اب فرا ادب اور ادیب کا جائزہ لیں :

- اس وقت ادب اور ادیب دونوں کا عالم سے رابط نہیں ہے۔
- ادیب کی ذہینیت پر شرمسوار ہے۔ یعنی ادیب "سمیٰ اور میظناً" ہے۔ وہ دیبات کو گنتی شماریں نہیں لاتا۔ اس کے نزدیک عالم سے مفہوم شری عالم ہیں۔ شر ایک قیامت ہے جو ہم پر انڈسٹریل رویدادیشن نے ڈھانی۔ شر پاکستان کا نامایندرہ نہیں ہے۔ شر میں ایک بیکانہ کھجوری کھجور پایا جاتا ہے۔ خیال کے مغربی فیشن اس کھجور کو سمجھتے ہیں۔ شلیساں دبم سے اسے کوکولا کلکھی کہا جاتا ہے۔ شر کے لوگ مغربی فیشن اور انڈسٹریل رویدادیشن کی پیداوار ہیں۔ اس یہے مصنوعی ہیں۔ ان کا اپنے کلکھ اور روایات سے تعلق نہیں۔ تاجر کپیٹیشن اور صنعت پرستی کی دھن میں سرگردان ہیں۔ عمدہے دار سٹیشن نزدہ ہیں۔

مزدور اس سوچنام کے نزیرے لگانے میں صروف ہیں جس کے باسے میں انھیں کچھ علم نہیں۔ عالم، جو مغرب سے تحصیل علم کر کے آئے ہیں، بدشی خطوط پر سوچتے ہیں۔ طلباء آن جانے میں ہٹلینگ بجاتے ہیں۔ سیاستیے ذاتی انتدار کی ہوس کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

بے شک شہر ایک دیدہ زیب جنت ہے۔ ”کسے را با کسے کارے ز باشد“ قسم کی جنت، جہاں ہر کوئی اپنی وہن میں لگا ہے۔ آج کے ادیب کے لیے شرہی دُنیا ہے۔ شر ہی زندگی ہے۔

۳۔ حکومت ادیب اور ادب سے لیکر بے تعلق ہے۔ کوئی ادیب فوت ہو جائے تو ان طمار افسوس کا بیان چھپ جاتا ہے کبھی کبھار کوئی دیزی بیا اہل کار اعلان کرتا ہے کہ کاب ادیبوں کا فرض ہے کہ قوم کو راستہ دھایں۔ انھیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ خداداد بھول کے راستے بند پڑے ہیں۔

۴۔ چند ایک سرکاری ادارے جو ادب اور ادبیوں کے لیے بنائے گئے ہیں، اسال میں ایک نہ تائی کا جلسہ کرتے ہیں اور باقی سال بیٹھے اونگھتے رہتے ہیں۔ بیچارے کیوں نہ اونگھیں۔ ادیب کی نلاح سے متعلق ان کی تجاویز متعلقہ علکے میں یوں بے تعلقی کا شکار ہو جاتی ہیں جیسے بینک میں فقیر گھس آئے۔ کبھی کبھار یہ ادارے سیمینار قسم کا اکٹھ کردا ہے ہیں جس میں باقی ہوتی ہیں، نیک خواہشات بھری باقیں، علی باقیں، کتابی باقیں، مخہر زبانی باقیں۔

ادب کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ کتابیں نہیں چھپتیں۔ ایک طرف تخلیق کی دُنیا میں طوفان آیا ہوا ہے۔ نوجوان جذبہ تخلیق سے یوں بھرے بیٹھے ہیں، جیسے ماں اس سے بھرا ہوتا ہے۔ دوسری طرف پرو جیکشناں کے ذرائع مسدود ہیں۔ مزید مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ نوجوان ادیب بغل میں سوڈے دبائے پھرتے ہیں۔ پبلشرا نہیں لگا س نہیں ڈالتے۔ پیشہ ادیب شوق اشاعت سے مجبور ہو کر فرض لے کر اپنی کتاب خدچھا پنے پر موجود ہوتے ہیں۔ اگر بفتر منی محال پبلش کتاب چھاپ نہ سوالم اسال ایک ہزا رکا ایڈیشن

چلتا ہے۔

ادبی جمیں سے روز بعزم بند ہوتے جا رہے ہیں۔ میڈیا انھیں اس قابل نہیں سمجھتی کہ اشتاریں سے نوازے۔ وہی مددودے سے چند لوگ انھیں پڑھتے ہیں جنھیں پرچہ اعزازی طور پر بھیجا جاتا ہے۔ پاکستان میں ایک اندازے سے پانچ ہزار لاٹر بریاں ہیں۔ اس کے علاوہ مکول اور کالج ہیں جہاں ادبی پرچل اور کتابوں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکار کو ادب پر اعتماد نہیں۔ وہ اخلاقِ رائے کو برداشت نہیں کر سکتی، وہ نہ یقیناً ایک سرکاری پبلشنگ ادارہ قائم ہو چکا ہوتا۔ دیسے بھی ادبی تحریر بے اثر ہے۔ آج کے دور میں جس میں پگڑی اچھائی کی طاقت نہیں، وہ تحریر بے اثر ہے۔ ادب کی یقینت صوریہ بلوچستان کے متزادت ہے۔ اتنا بڑا صوبہ جب ہیں وہ ایک سڑکیں، باقی بے سڑک، بے رابط۔ اتنا بڑا ادب جس میں دو ایک پگڑنیاں، باقی لئے دت میدان۔

جانبِ والا میں اکیلا ہی نہیں، قلم قبیلہ میں میرے اور بھی بھائی ہیں جو سچی بات کہتے ہیں، سادہ بات کہتے ہیں۔ جو اپر ٹریڈ ادبی فیشنوں کو منہ نہیں لگاتے۔ اپنی منی کی خوشبو کا احساس رکھتے ہیں۔ علاقائی رنگ میں لکھتے والے اس صحن میں پیش پیش ہیں۔ دیسے بھی بدستی سے اُردو زبان درباسی زبان ہے، اور دربارداری ہمارا قومی و صفت ہے۔ اُردو زبان میں سچی اور سادہ بات لکھنا بے حد مشکل ہے۔ میرا ایمان ہے کہ یہ کچھ دیکھر، مغرب ندگی، ظاہر پسندی اور چمک دیک کا عدد آخری دھون پر ہے۔ اس دور نے باہر کے ادبی کو دیوتا بنایا۔ اس کی پوچھا کی۔ اسے منایا۔ باہر کے ادبی کھاکاٹیں بھم پھنپھائیں۔ اس کی دیکھ بھال کی۔ اسے لوانا۔ اس حد تک نواز کہ رادون بن گیا۔ راکشش بن گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ باہر کے ادبی کا دور زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ دور میرے ہوش میں آیا تھا اور اب میرے سامنے ہی اس کے اختتام کے عوامل واضح طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔

جب چیز نہیں کو پر لگ جائیں تو جان لوك جلد ہی جلے ہوتے پر عل کا دھیر لگتے والا ہے۔
یہ قدرت کا اصول ہے۔ یقین کیجیے کہ باہر کے انسان کا رون گرد ہے۔ اندر کا مام ابھر
رہا ہے۔ سائنس دم تظری ہے۔ ذہب اندر کے انسان کا سوالگت کرنے کے لیے آگے
بڑھ رہا ہے۔ ادب کی بے قدری کا دور ختم ہونے کو ہے۔

آپ کا نام

ناموں کی اہمیت کا احساس مجھے فقیر چند نے دلایا۔ قسم سے پہلے کی بات ہے، فقیر چند میرا ہم جماعت تھا، درست تھا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج میں ہم لکھنے پڑھتے تھے۔ فقیر چند کی منگنی ہوئی دلی تھی۔ پھر تو کوہ لوٹ گئی ہے۔ میں نے فقیر چند سے پوچھا "یار، تیری منگنی لوٹ گئی ہے کیا؟"

"بولا" تو میں نہیں۔ میں نے توڑ دی۔"

"کیوں؟ کیا لڑکی اپنی رسمتی؟"

"بولا" اپنی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔"

"پھر تو نے منگنی توڑ کیوں دی؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "میں کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا جس کا نام بست کو رہو۔" اس کی بات سن کر میں ہسکا بکارہ گیا "یار، تو تو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ پھر ناموں کو اہمیت دیتا ہے؟"

کہنے لگا "اہل، ہول۔ اور نام کو اہمیت دیتا ہوں۔ سو دلار؟"

میں نے کہا "مجھی نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بولا" پڑتا ہے۔ بہت پڑتا ہے۔"

"جو ایسی بات ہے تو اس کا نام بدل کر کو شلیا رکھو۔"

کہنے لگا "یار، تم مجھی احمد ہو۔ جو لڑکی بستو بستو کہلو اک جان ہوئی ہو، اب اس کا

نام بدلتے کافائڈہ چھوڑو، یا، بس کچھ دیا کہ میں پسند سے شادی نہیں کر سکتا۔
میں نے کہا "ایار، عقل کی بات کر" ॥

بولا "بھائی، پسند ناپسند عقل کی بات نہیں ہوتی۔ تجھے اتنا بھی نہیں
معلوم ہے پھر ہنس کر کہتے رہا" دیکھو، بھلوں میں مجھے خوبزہ پسند ہے حالانکہ خوبزے میں بھل کی
بات نہیں۔ نہ مفرح ہے، نہ خوبزدار ہے، نہ ذائقہ دار ہے۔ اس کے باوجود مجھے پسند ہے۔
کر لے میرا کیا کرنا ہے" ॥

اس زمانے میں مجھے میں سب سے بڑی خایری یعنی کہ میں عقل کا پرستار تھا۔ ہربات عقل کی
کسوٹی پر لکھ کر جانپتا تھا۔ فلسفے کا طالب علم تھا۔ رسول، ہمسے فرائید، برگسائی اور نیٹیٹے کا
فین تھا۔

اس روز میرے دل میں شبہ سا بیٹھ گیا کہ کیا نام اتنا ہی اہم ہے کہ ایک نوجوان نام کی
بانپر بیا کرنے سے انکار کر دے؟ یا کسی لوگ کی سے اس کے نام کی وجہ سے محبت کرنے لگے؟
اب مجھے شعور ہے کہ نام بہت اہم ہوتے ہیں اور وہ افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

حال ہی میں پاکستان ٹیکے و ڈن نے اپنے جانے پہلے نے پروگرام فنی فنی میں نام کی تائیر
پر بہت عمدہ تبصرہ کیا۔ ایک صاحب سڑک پر سکوٹر پر جا رہے تھے۔ غلط طریقے سے موڑ کاٹا تو
ٹرینک سپاہی نے روک لیا۔ جیب سے چالان کی کاپی نکالی۔ پوچھا کیا نام ہے تھا؟ سکوٹر سوار
نے جواب دیا۔ مستنصر تارڑ۔ نام سن کر سپاہی گھبر گیا۔ پھر سے پوچھا۔ سکوٹر سوار نے اپنا نام دہرا لیا۔
سپاہی سُخن میں پسل ڈال کر کچھ دریو چتارہ لے۔ پھر لہلا "جا جا۔ آئندہ اس طرح موڑ کاٹنا۔ سمجھا؟"
ناموں کی بات ہو رہی تھی۔ محفل میں ایک ڈپنی کشہر بیٹھے تھے۔ بے "ہماری کچھری میں
ایک محسریٹ ہیں، کدرخان۔ پڑھے لکھے ہیں۔ مناج کے کٹوڑے نہیں۔ بھر دیں معقول ہیں۔
لیکن جس کا مقدمہ ان کی کچھری میں لگاتا ہوں، وہ کچھری بدلتے کی درخواست میں دیتا ہے۔ بڑ
مشکل میں پڑے ہیں اہم" ॥

نام کے تین پہلو ہوتے ہیں : صوتی اثر، معنوم اور تاثیر۔ کچھ نام صوتی اثر کے لحاظ سے ہلکے چھٹکے ہوتے ہیں۔ کچھ بھاری بوجھل ہوتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہی گاڑھے ہوتے ہیں۔ اور کچھ حلن میں یوں پھنس جاتے ہیں جیسے بھی کاشا۔ ان کا بونا حلن پر خلم کرنے کے متادت ہوتا ہے۔ مثلاً غضنفرالیسانم ہے جسے آپ بار بار یوں تو یقیناً آپ کو ٹانسلن کا عارضہ لاحق ہو جائے۔

اوسریز پاکستانیز فاؤنڈیشن میں میرے ایک دوست تھے۔ ان کا نام غضنفر تھا جسے لیے بڑی مشکل پیدا ہو گئی۔ میرا گلائر پلے سے ہی حضردب ہے۔ میں نے سوچا، اب کیا ہو گا؟ روز گھر جا کر نمک کے غزارے کرنے پڑیں گے۔ وہ تو اللہ نے کرم کر دیا کہ ان کے نام کا دوسرा حصہ مددی نکلا، وہ نہ مجھ پر ای این تی کے پھرے لگاتے لازم ہو جاتے۔ کراچی میں میرے ایک ہم کار تھے، کلکشاں حقانی۔ میں ان کے ساتھ چھ بیسے رہا۔ اسج تک لگلے کا کتو اس سوچا ہوا ہے۔

ہمارے ایک جانے پہنچانے ادیب ہیں۔ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ مراج کے باع وہ سار ہیں۔ انھیں صرف اس یہے دوست نہیں بناسکا کہ ان کا نام خٹک ہے۔

ناموں کے معاملے میں ایک اور وقت ہے۔ ماں باپ بچے کا مقدس نام رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً محمد علی، اللہ بخش، محمد حسین۔ محمد علی کو نہ آپ محمد کہ کربلا سکتے ہیں نہ علی کہ کر۔ بھری بھی ہے کہ پیار سے نام بکارا بھی نہیں سکتے۔ میرا تجوہ ہے کہ اخبارِ محبت کے لیے نام بکارا نہیں دعویٰ کرتا ہے۔ مثلاً میرے بیٹے کا نام علکی ہے۔ اگر میں اسے علکی کہ کربلا وہ تو اجنبیتی سی عجوس کرتا ہوں۔ اس لیے میں اُسے اچھی کہ کربلا تاہوں۔

پتا نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ جس کے لیے آپ کے دل میں محبت ہے آپ اس کے نام کو بکارا تے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ رضیہ کو رضنگ کہتے ہیں۔ اقبال کو بال، مقبول کو بولی۔

مقدس نام موزوں نہیں رہتے۔ کم از کم نام کا ایک حصہ ضرور غیر مقدس ہونا چاہیے
کہ آپ اسے جواہد لا کے سکیں، غصے میں گالی دے سکیں۔ درجھے مُٹھ کے سکیں۔

فرض کیجیے آپ کا نام غلام محمد ہے۔ چلیے ایک حصہ تو مقدس نہیں۔ لاد پیار، چل، غصے
کا انہمار اس حصے کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غلام محمد میں ایک وقت پیدا ہو گئی۔ لوگ آپ
کو غلام کہاں کہاں پکاریں گے۔ آپ ہی سوچیے کہ اگر ایک فرد سالماں سال غلام کی آواز پر جی ٹان
کھتار ہے گا تو اس کی نفسیات کا تو فالودہ بن جائے گا۔ بے چارہ بالکل ہی غلام بن کر رہ جائے گا۔
ایسا نام رکھنے پر تو بے رحمی والوں کو ایکشن لینا چاہیے۔

پھر ایک اور وقت پیدا ہو جاتی ہے۔ چلیے ماں باپ تو مقدس نام رکھ کر اپنے فرض
سے بکدوش ہو گئے۔ غلام محمد جوان ہوا، تحصیل علم سے فارغ ہوا، بڑے عمدے پر فائز ہوا تو
بے چارے کو نام کی وقت پڑ گئی۔

آج کل کے مغرب زدہ دور میں کچھ لوگ پسند نہیں کرتے کہ ان کے نام سے مذہب کی
جو آئے۔ وہ سیکلر بنا لپسند کرتے ہیں۔ نام سے مذہب کی بُراؤ تے تو سیلیں میں فرق آتا ہے۔ اس
مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ اپنے نام کے ساتھ ایک اور لفظ بڑھا دیتے ہیں، بطریق تخلص۔
مثلاً غلام محمد نے سرشار کا لفظ بڑھایا۔ پھر نہ ہمی نام کو کیا فلاج کر لیا۔ یوں وہ اپنام جی ایم رشار
لکھنے لگے۔ نذر محمد خود کوں م راشد لکھنے لگتا ہے۔ محمد حسین ایم ایچ چھٹے میں پناہ لیتا ہے۔

معنوی پلو سے نام کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً میرا ایک دوست ہے، انور دین۔
اس کی شخصیت دیکھیے تو نام کی ضد ہے۔ نہ اس میں نہ رہے، نہ دین ہے۔ نام لینے والا خاہ مخوا
شرمندہ ہوتا ہے۔ جیسے برباد چھوٹ بول رہا ہو۔ پھر میری ایک عزیز ہیں۔ ان کا نام حسین ہے۔
دیکھنے میں انھیں حسن سے دُور کا تلقن بھی نہیں۔ جب انھیں حسین کہ کہا جاتا ہے تو ان کی بد صوبتی
اور بھی نہیاں ہو جاتی ہے۔ ایک خالون پر اس سے بڑھ کر اور کیا فلم ہو سکتا ہے۔

میرے ایک دوست ہیں، جمال خان۔ ان کے خدا خال بڑے تعلیمات ہیں۔ وہگ گورا

ہے۔ چھرہ اس تدریک پر ڈبے کہ جمال پر بالکل فرض بیٹھتا ہے۔ لیکن خان سارا طسم توڑ دیتا ہے۔ سیدھی بات ہے کہ خان کے ساتھ بہت سے نام لگتے ہیں۔ مثلاً بیسبت خان، دلادر خان، بہادر خان، اکھڑ خان، عظت خان، جلال خان۔ جمال نہیں لگتا۔ کہاں جمال کہاں خان۔ میں نے اپنے دوست جمال خان کو کئی بار سمجھایا ہے کہ جمالی میرے یہ گنگا جمنی نام نہیں چلتا۔ ایک حصہ میٹھا دوسرا غمکن۔ بات نہیں بنتی۔ لیکن اس نے کبھی میری بات کو درخواستِ اعتنا نہیں سمجھا۔ چلو، ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔

نام کے دو حصوں میں بے ربطی نہیں ہونی چاہیے۔ چھرہ بھی ضروری ہے کہ نام اور شخصیت ہم آہنگ ہوں۔ اہل غرب نے نام کی اہمیت کہ بالکل نہیں سمجھا۔ انھوں نے ناموں کا ستیناس کر کے رکھ دیا ہے۔ کوئی خود کو ناک کھلاتا ہے، کوئی دُلعت، کوئی گرد و اڑ کا نام رکھے بیٹھا ہے، کھلنا بھلنا نک۔ حیرت ہے کہ اتنے منصب، لیکن اتنے بے حس۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ایسے بے معنی نام اخیں سُو بھتے کس طرح ہیں؟ نہ معنے نہ سر نہ تال۔ رومنی ناموں سے اللہ پناہ میں رکھے۔ میں رومنی لکھنے والوں کا مدراج ہوں۔ دوستوں کی کافیں ہوں۔ دوستوں کی امداد کیا تو سب سے بڑی مشکل ناموں نے پیدا کی۔ آدمی اور سلطراں کا ایک ایک نام۔ اور ہر زماں میں تقریباً ساری اسے بی سی ڈی سماں ہو گئی۔ میں نے تو پورا نام کبھی نہیں پڑھا۔ دیکھ لیتا۔ پسچاہ لیتا۔ پہلا حصہ پر سے شروع ہوتا ہے، دوسرا اوری سے۔

نقشیں سے پہلے یہاں ایک انگریز مکشز تھے، مسٹر مون۔ میں نے مون صاحب کو بہت سمجھایا۔ میں نے کہا "آپ دولتِ انگلشیہ کے نایande افسر ہیں۔ آپ کی مملکت بڑی غیرم ہے جس پر سورج غروب نہیں ہوتا۔ اتنی غلیظِ حملت کے نایانے کو زیر بند نہیں دیتا کہ خود کو مون کملوائے۔ اقل تو چاند میں نسائیت کا عضر ہے، دوسرے چاند گھٹا بڑھتا، اول تا بدلہ تارتہا ہے۔ تیسرا روشی کے لیے دوسرے کا محتاج ہے۔ جناب والا، بہتر ہو گا آپ ہون کی جگہ اپنا نام سن رکھ لیں۔ مسٹر مون نے میری بات کو درخواستِ اعتنا نہ سمجھا۔ سمجھ لیتے تو اسچ سلطنتِ انگلشیہ پر سورج

عذوب نہ ہو پاتا۔ بہر صورت، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

صرف مُون کی ہی بات نہیں، ہم آپ کو بھی سمجھا رہے ہیں۔ آپ سمجھیں نہ سمجھیں۔ آپ کی صرفی۔

میرے کئی ایک دوست ہیں جن کے ناموں پر مجھے اعتراض ہے۔ مثلاً آفتاب ہے۔

میں نے کئی مرتبہ اسے سمجھا یا ہے کہ یارا یہ نام بہت گرم ہے۔ دیکھو تو یہاں پہلے ہی انی گرمی ہے۔ صرف سدرج کی ہی نہیں، اس کے علاوہ نئی نسل کی بھی تھے۔ موڑ یوں ارتلتے بدلتے ہیں جیسے باول شکلیں بدلتا ہے۔ غصتے ناک پر دھرے ہیں۔ موڑ سائکل لگاف لگاف کھاؤں کر رہے ہیں۔

میں نے کہا ”بھائی آفتاب، یہ نام شاید ٹھنڈے ملکوں میں چل جائے۔ یہاں نہیں چلے گا۔ ہماری پریبلم تو ٹھنڈے رہنا ہے۔ تو کوئی ٹھنڈا امیٹھانام رکھے۔ آفتاب کی نسبت تو کوکا کولا ہی اچھا ہے؟“ لیکن اس نے میری بات نہیں ہانی۔

پھر میرے کرن فرما جالاں ہیں۔ اب میں ان کو کیسے سمجھاؤں کہ جناب جمال کوئی قابلِ حضور ہے۔ اس میں سے ایگر میں کی بُو آتی ہے۔

پھر ایک محترم ہیں، لطیف۔ اب میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ لطیف کو کوئی سمجھیگی سے نہیں لے گا۔ لوگ صرف تفریخ سمجھیں گے، اور یہ کتنی بُری بات ہے۔

صاحب! اب میں کس کا نام گذاشیں۔

پھر ہمارے ادبیوں نے ناموں کا ستیاناں کر کے رکھ دیا ہے۔ پہلے تو ناموں کے ساتھ شخص جوڑے۔ کوئی مخودم ہے۔ کوئی آہ ہے۔ کوئی حدن ہے۔ کوئی ملال ہے۔ زیادہ تر غنوار قسم کے۔ پھر یوں کیا کہ نام کے ساتھ جنم بھومنی کا نام ٹانک دیا۔ مثلاً مجید لاہوری (اضیا جالندھری)، پاپر ٹالوی۔ ایک صاحب مرنچھ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ سورجخودی بڑھا دیا۔ اس پر ہم خوف نزدہ ہو گئے کہ کہیں ریاست پونچھ کے کوئی ادیب پُر بھجوی

لکھنا شروع نہ کر دیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے بیسیوں ادیب آج بھی اپنے نام کے ساتھ دہلوی، اجیری، اللہ آبادی، اکبر آبادی لکھ رہے ہیں، حالانکہ انھیں اب ان شہروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اب ذرا اداروں کے نام یہیے۔ الحمد للہ کہ پاکستان اب اسلامی جمہوریہ ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریہ کے تحت کئی ایک نام بدل جانے چاہیں تھے، جو آج بھی جوں کے توں قائم ہیں۔ مثلاً سرکار کو ہم ایسا بھی گورنمنٹ آف پاکستان کہتے ہیں۔ یعنی حکومت کا لفظ آج تک قائم ہے۔ اگر آپ اسے حکومت کہیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے کارندے حکمرانی کریں گے۔ مونپھ پرستاً دیے رکھیں گے۔ کالر سٹفت رہیں گے۔ گردان اکڑی رہے گی۔ ساتھ بیچھے کر بھی اُو پنچہ رہیں گے۔

فرض کیجیے آپ حکومت کے لفظ کو بدل کر خدمت کا لفظ رائج کر دیتے ہیں۔ یعنی خدمت پاکستان، تولازم ہو گا کہ کارندوں کی نفیات پر کچھ نہ کچھ اثر پڑے۔ خادم نہیں نہیں، حاکم نہیں رہیں گے۔ بادشاہ کہ تو ہم نے صدر کا لقب دے دیا۔ خوب کیا۔ لیکن دزیر اور وزارت جوں کے توں رہے۔ جو دزیر ہیں وہ تو وزارت کریں گے، اور وزارت من مانی کرے گی کیوں نہ کرے؟ کیوں نہ مونپھ مردوں کر بیٹھے؟ کیوں نہ عوام سے ممتاز رہے؟ نام کے اثر سے خود کو محفوظ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ عمدہ اس سے بھی زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ بھی تو کچھ ممالک نے وزارت کو نظمات میں بدل دیا ہے۔

پھر چھوٹے عمدوں کی بات یہیے۔ آپ مجھے ڈائرکٹر بنادیں تو مجھے احساس ہونے لگے گا کہ میرا کام ڈائرکٹ کرنا ہے۔ ہدایات دینا ہے۔ حکم چلانا ہے۔ مشورہ لینا ہیں۔ فیصلے کرنا ہے۔ اسی طرح کمزور ہو رہے۔ کمزور تو کمزور کرے گا۔ وہ کسی کی کیوں نہ ہے؟ مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم میں یہ احساس پیدا نہیں ہو۔ اک نام بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ فرد کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ ہم اس کے اثر سے بچ نہیں سکتے۔

میں نے زندگی میں ایک نام دیکھا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل، جامع اور پنفیکٹ ہے۔ صوتی، معنوی، نفسیاتی ہر لحاظ سے اعلیٰ دار فتح ہے۔ اس میں مُسر ہے، لے ہے، نعمتی ہے، معنوی لحاظ سے مثبت اثاثات سے بھر پور ہے، مادرن ناموں کی طرح محقر ہے، جانت ہے، پیارا ہے، مفہوم کے اعتیار سے قابلٰ احترام ہے، قابلٰ ستائش ہے اور وہ ہے ^{محمد} سچان اللہ اکیا نام ہے!

غُصیل دَور

آج کا دور بڑا غُصیل دور ہے۔ ہر کوئی غصتہ ناک پر دھرے پھرتا ہے۔ ہر کوئی مُنتظر لہتہ ہے کہ کوئی بات ہو، بہانہ بلا تھا آئے تو وہ غصتے کی تلوار نکال کر اسے اڑائے۔ اور دن کی بات چھوڑیے۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ بات پر تاؤ کھا جاتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک کمرہ در در نر و س آدمی ہوں۔ کمرہ در در نر و س آدمی کو غصتہ لوں بھجوڑتا رہتا ہے جیسے بچتے میری کے درخت کو بھجوڑتے ہیں۔ مضبوط یا طاقت در انسان پر غصتے کاں نہیں چلتا۔ تو غالباً ہرے کہ آج کا غُصیل دور کمرہ در در نر و س لوگوں کا دور ہے۔

آج کل لوگ اپنی نسوان سے یوں حکیمت رہتے ہیں جیسے وہ کھلونے ہوں۔ ذرا سی بات ہوئی تو تاؤ میں آگئے اور لگے اپنی نسوان کو بجانے۔ جیش کو وہ یوں بھڑ جاتی ہیں جیسے سانگی کے تار ہوں۔ بھران کی بھن بھن کی دصلی بھتی ہے اور یہ بھن بھن سارے جسم میں یوں گوئی ہے جیسے اندر کھیل کا چھتا بھڑا گیا ہو۔ بھر فون اُبلنے لگتا ہے اور عقل دہوش دھندلا جاتے ہیں۔ اس کا یہ سلطب نہیں کہ غصتہ نبہی چیز ہے۔ عَصْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى کی ایک نعمت ہے جو انسان کو اس یہے عطا ہوتی ہے کہ خطرے کے وقت اپنا بجا دکر سکے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہیں غصتے کی تلوار بخش رکھی ہے کہ جب کبھی خطرہ سامنے آئے تو یہ تلوار نکال کر اپنی حفاظت کر سکیں۔ مشکل ہے ہے کہ تم نے اس تلوار کو کھلونا سمجھ لیا ہے اور ہر وقت اس سے حکیمت رہتے ہیں۔

علمروں کا کہنا ہے کہ بے شک غصتہ ایک ڈلینس میکرزم یعنی حناظتی چیز ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ فرض کیجیے اچانک دو آدمی آپ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ میں صرف آنھوں کو طاقت

موجود ہے۔ دو ادمیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آدھ کلو طاقت ناکافی ہے۔ انسانی جسم ایک لمحہ میں ہے۔ آپ کے جسم نے صورتِ حال کو دیکھا۔ فٹ سے ایک حصیلی کے منہ کو کھولا اور اس میں سے پنڈت پر خون میں ٹپکا دیے۔ اس محلول کو ڈاکٹر لوگ ایڈریلین کہتے ہیں۔

جو نبی ایڈریلین آپ کے خون میں داخل ہوتی ہے وہ کھولنے لگتا ہے۔ نسوان میں اک طوفان آ جاتا ہے۔ بُجھے اٹھنے لگتے ہیں جیسے سوڑے میں پچھلی بھر منک ڈالنے سے بُلبلے نکلتے لگتے ہیں۔ بھر خون تیزی سے جسم میں چلتا ہے۔ آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ کنپشیاں تھر کرنے لگتی ہیں۔ یعنی آپ کی آدھ کلو طاقت بڑھ کر ایک کلو ہو جاتی ہے تاکہ آپ حملہ اور دل کا مقابلہ کر سکیں۔ اس سارے عمل کو خفہ کتے ہیں۔ آج کے غصیل دور کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خطرے کا مقام ہو یا نہ ہو، مقابلے کی صورت ہو یا نہ ہو، اپنی حفاظت کی صورت ہو یا نہ ہو، لوگ خواہ خواہ غصتے میں آ جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کیسے کہ غصتے کے عالم میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ کفران نعمت ہے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو ناجائز طور پر استعمال کرنا بہت بڑھی ناشکری ہے۔

پُرکش زمانے میں جب انسان جنگلی دور میں تعالیٰ غصہ ایک اندازہ بہاؤ کرتا تھا۔ ہوتا ہوں تھا کہ اگر آپ پرسی نے تھر چینکا اور پھر بھاگ لیا، اس پر آپ کو غصہ آ جاتا۔

آپ اپنا تیر کیا اٹھا لیتے اور گھر سے باہر نکل جاتے۔ باہر کوئی بھی چلتا پھر تا نظر آتا چاہے وہ انسان ہوتا یا پرندہ یا پر طوسی کی بھیں، آپ اس پر تیر چلا دیتے۔ اور پھر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے بعد جھوپڑے میں داخل ہو کر آرام سے اپنے کام کا ج میں صورت ہو جاتے۔ اس زمانے میں بدے یا انتہام کا سوال نہ تھا۔ صرف دل ٹھنڈا کرنے کی بات تھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ انسان مترب ہوتا گیا اور اس کی سمجھ میں آگیا کہ غصہ نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ غصہ دلانے والے کو سزا دی جائے۔ آج کی صورتِ حال کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم پھر سے جنگلی دور میں جا داخل ہوئے ہیں۔ جب بھی ہم غصتے میں آتے ہیں تو جوش میں باہر نکل جاتے ہیں۔ سڑک پر چلتی بیوں کو روک کر انھیں اگ لگادیتے ہیں۔ چلی کاڑیوں پر پھر چینکتے ہیں۔ چار ایک فترے لگاتے ہیں۔ بُجھے سے بھاگ نکلاتے ہیں اور یوں

دل تھنڈا کرنے کے بعد اپنے کارنا سے پر نازال خوشی خوشی گھر لوٹ آتے ہیں۔

بھی میں نہیں آتا کہ دو رجید کے لوگ ہر وقت غصتے میں کیسے رہتے ہیں! بھی غصتہ تو ایک آنی جانی چیز ہے۔ لیکن اسے قائم کر لینا، یہ بات میری بھی نہیں آتی۔ سیالوں کا کہنا ہے کہ غصتہ پہاڑ کی برفیلی چوٹی کی طرح ہے۔ اپ چوٹی پر جاسکتے ہیں۔ دہان قیام نہیں کر سکتے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں اکثر غصتے میں آجاتا ہوں۔ لیکن جونی غصتے میں آتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ باہر نکل جاؤں۔ پتا نہیں کیوں۔ لیکن غصتہ آجاتے تو وہ مجھے کامنے لگتا ہے۔ وہ مجھے اپنے چمکل میں پکڑ لیتا ہے اور پھر لوں توڑتا سروڑتا پخواڑتا ہے جیسے کوئی کپڑا دھوبی کے لاٹھ چڑھ گیا ہو۔ اس ماہ پیٹ سے تنگ اگر میرا جی چاہتا ہے کہ میری جان پھوٹ جائے۔ پھر جب غصہ اڑ جاتا ہے تو میں شکھ کا ساس لیتا ہوں۔ اب اس وقت میں سوچتا ہوں کہ یہ غصہ کسی بیودہ چیز سے جو دمرے کو نقصان پہنچانے کی نسبت مجھے زیادہ نفعان پہنچا آتا ہے۔ مجھے توڑتا ہے، مردڑتا ہے، میرے جسم کو بلدنی کی طرح بلکہ کرکھ دیتا ہے، میرے ذہن کی بچپنندی اڑا دیتا ہے۔ سیانے سچ کتے ہیں واہی غصتے ایک الی چھری ہے جو انسان اپنے ہی سینے میں جھوٹک لیتا ہے۔

پُکلنے نہانے میں لوگ غصتے کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ غصتے میں آتے جاتے مگر یہ تسلیم نہ کرتے تھے کہ وہ غصتے میں ہیں۔ اور پھر جب غصہ اڑ جاتا تو اپنی اس کمزوری پر شرم سار ہوتے اور دل ہی دل میں اپنی حاقدت پر پشمایی نہیں کرتے۔

ان دنوں کوئی بھی غصتے یا تشدید پر فخر نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس آج کل لوگ غصتے اور تشدید کے گنگا تے ہیں۔ انھیں یوں اپنے سینے پر سمجھائے پھرتے ہیں جیسے وہ تختے ہوں۔ لوگ علانیہ تشدید کا پرچار کرتے پھرتے ہیں، اور جو شخص ان کی ہاں میں ہاں نہ ملا شے اسے حقدادت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

پتا نہیں سوچ کا یہ اندازہ ہما سے ہاں کہاں سے آگیا ہے! صزو ر دساور سے آیا ہو گا کیونکہ یہ اندازہ مشرقی نہیں۔ اس میں ہماری روایات کا نگہ نہیں۔ بلاشک دشتریہ کوئی بیرونی

چیز ہے جسے چوری چوری ہمارے لئے میں سمجھ کر کے بھیجا گیا ہے تاکہ ہماری مٹی میں نوپائے،
 پھلے پھولے اور غاردار بھاڑی کی طرح پھیل جائے اور تحریب کے کانٹے بھیر دے۔
 بڑی طاقتیں یہ پسند نہیں کرتیں کچوٹی مملکتیں اُن چین سے جیش۔ اس لیے وہ ایسی
 سوچوں کے جراہیم بھیجتی رہتی ہیں جو ذہنوں کو مشتعل کریں، جذبات میں جوش پیدا کریں، عفتوں
 اُجھاریں، اشترد پسندی کو شہر دیں۔

آپا

اپنے ایک افسانے کا تجزیہ

آپا میری جانی پچانی کردار کمانی ہے۔ کچھ لوگ تو اسے میری پچان سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود میرے نزدیک وہ ایک ”فل گیپ“ کہانی تھی۔ اب بھی ہے۔ اس کی درد جوہ تھیں: پہلی وجہ یہ تھی کہ یہ کہانی کسی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ فرمائش کرنے والے لوگ میرے محسن تھے۔ مجھے ان کے احسان کا بدل رچانا تھا۔ ایک اخلاقی فرض پُردا کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اخلاقی فرض پُردا کرنے کی خواہش چاہے کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، پھر بھی اس سے عمدہ برآئہ ناجان چھڑانے کے مترادف ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپا میں نے اپنی خواہش کے یا آئند کے تحت نہیں لکھی تھی۔ اگر فرمائش نہ ہوتی تو شاید میں آپا پر کبھی افسانہ نہ لکھتا۔

دوسرا دیج بھی سُن لیجیے۔ میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں جنہیں شہرت پہلے ہی پیشگی طور پر مل گئی، اور بعد میں افسانہ نویسی سیکھنا پڑی۔ عام طور سے ہوتا یوں ہے کہ لوگ پہلے لکھتے ہیں، باسابارکھتے ہیں، پھر چھپتے ہیں، باسابار چھپتے ہیں۔ پھر کہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ ہڈو شہرت حاصل ہو جائے۔

میں نے پہلی چیز بھی فرمائش پر لکھی تھی۔ خواہش یا آئند کا عنصر نہ تھا۔ ویسے ہی لکھ دی۔ جان چھڑانے کے لیے۔ وہ چیز چھپ گئی۔ غالباً چھپی ہی نہیں بلکہ بڑے دھوم دھر کے سے چھپ۔ یوں بھی بھلئے ان جانے میں شہرت حاصل سو جانے کے بعد میں مشکل آپڑا کی مجھے بنیگ سے

سوچا پڑا کہ کیا لکھوں؟ کیسے لکھوں؟ سوچ سوچ کر میں نے یہ طے کیا کہ افانے کا موضع
لوکھا ہو۔ گمرا ہو۔ کوئی عظیم حقیقت۔ عام نہیں، عظیم۔ دل کی تھوں میں چھپی ہوئی کوئی بات۔
جتنی دُور کی کوڑی لاؤں، آنا ہی اچھا۔

اس زمانے میں آپا ایک عام کروار تھا۔ ہر گھر میں چولے کے قریب چوکی یا پیر ٹھی پر
ایک نزاکت آپا بیٹھی ہوتی تھی جو زنگاہیں جھکاتے رکھتی۔ پڑ کی ادٹ میں سکاتی اور دھی آداز
میں بات کرتی۔ اس زمانے میں بھی آپا کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن کوئی بھی اسے دل سے نہیں
چاہتا تھا۔ البتہ ان دونوں ساجو باجی عام نہ تھی۔ بڑے بڑے اس کو دیکھ کر کالوں پر راتھے
رکھتے۔ بڑی بُرڑی صیار مُخہ میں انگلیاں ڈال لیتیں۔ نوجوان ساجو باجی کو دیکھتے تو انکھیں
کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ باچپن کھل جاتیں۔

آج کل تسریکیں پر، بازاروں میں ادکانوں پر، بسوں میں، روشنوں پر، گلیوں میں،
ہر جگہ ساجو باجیوں کی بھیر لگی ہے۔ آج کل تو آپائیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن اس زمانے
میں آپا ایک عام چیز تھی، ابے حد عام۔ ایک ایسے افسانہ نویس کے لیے جسے پیشگی شہرت
مل جکی تھی، آپا سے عام موضع پر قلم اٹھانا بھلا کوئی بات تھی۔ ان درود جوہ کی بنابری میرے
نندیک آپا کی حیثیت ایک "فل گیپ" افسانے سے زیادہ تھی۔

اب فرمائش کی تفصیلات بھی سن لیجیے۔ لیکن آپا لکھنے کی فرمائش کرنے والے لوگ
کون تھے۔ کن حالات میں فرمائش کی گئی۔ اور میں اس فرمائش کو بُردار کرنے پر کوئی مجبور تھا۔
یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ ان دونوں میں ایک ماٹی سکوں میں ٹیچر تھا۔ تجوہ نہایت
قلیل تھی۔ کھانے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ اگرچہ میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ٹیوشن
نہیں کرنی لیکن حالات نے مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے ایک بھروسہ اور صاحبِ رسوخِ دوست
سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کوئی ٹیوشن دلادے۔ ایک روز میرے دوست میرے ہاں آئے۔
بوئے "ٹیوشن کرو گے؟ ارادہ بدلت تو نہیں گیا؟" میں نے کہا "ضرور کروں گا۔ ارادہ اورہ بھی

پنکا پہنچ گیا ہے۔“ دہ مجھے شر کے ایک رئیس کے گھر لے گئے۔ تعارف کریا۔ معزز رئیس نے میرا جائزوہ لیا۔ پھر کہتے لگے ”آؤ، میں تھاں تھاں سے شاگردوں سے ملا دوں یا معزز رئیس میرا تھاں کر کر چلے گئے تو میں نے آزادانہ انکھوں اٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دہ دلوں میرے رو بروہ سیٹھی ہیں : آپا اور ساجب یا جی۔ آپا بڑی تھی، سانوں تھی، نظریں جھوکائے ہوئے تھی۔ کبھی کھجارتکھیوں سے دیکھتی اور پتوکی اورٹ میں سکاتی۔ ساجب چھوٹی تھی، گوری تھی، پُبلی عتی۔ انکھوں میں انکھیں ڈال کر دیکھتی۔ مسکراتے جاتی اور لگاتار باتیں کہے جاتی۔

کچھ دیر تک وہ دلوں میرا جائزوہ لیتی رہیں۔ آپا جھکی جھکی انکھوں سے، ساجب علایہ طور پر ساجونے مُخہ بنایا۔ بات بدلتے کیے میں نے پُچھا ”کیا پڑھو گی؟“ ساجب چکپے سے اُمّی اور حساب اور الجرسے کی کتابیں اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں۔ حساب اور الجرا میں نے صرف میرٹک تک پڑھتے تھے۔ میرٹک کے امتحان میں حساب اور الجرسے کے پڑھے میں میں نے ۱۰۰ ایں سے صرف ۱۶ نمبر حاصل کیے تھے۔ حساب الجرا اپنے بیس کی بات نہ تھی۔ درصل میرا خیال تھا کہ ٹیش انگریزی کی ہو گی اور انگریزی میں میں اپنے اپ کو تین ما رخان سمجھتا تھا۔ حساب کو دیکھ اپنی امتیادوں پر پانی پھر گیا۔ ماٹھ پر پیستا آگیا۔ ساجب بات کو بجا نہ گئی، اور اس کا اٹھا رکھ کے بغیر نہ رہ سکی۔ جھٹ پٹ انبار دعاں نکالا اور میرے باختہ میں تھا دیا۔ میں نے کہا ”اس سمعتی سے کیلئے بننے گا۔ گھر سے کرنی تھا ان اٹھا لاو۔“ بس اس جلتے مجھے قاشم کر دیا۔ ابتدائی جائزوے کے تاثرات گویا معدوم ہو گئے۔

میں نے کہا ”ہمٹاؤ، اس مضمون کو۔ ہم بنسیوں کا مضمون نہیں پڑھاتے۔ انگریزی پڑھو۔ مضمون رہنا“ ساجب بولی ”انگریزی کیوں پڑھیں؟ اس میں تو ہم اپ لائق فائی ہیں“ اس پر میں نے فیصلہ کر دیا کہ کل سے پڑھانے نہیں آؤں گا۔ لہذا ادھر ادھر کی گپ میں وقت گزار دیا۔

اس کے بعد میں انھیں پڑھانے نہ گی۔ تیسرے روز وہ رئیس بُزرگ سکول میں

آگئے۔ بولے میاں، تم نے کمال کر دیا۔ ایک روز آئے، اس کے بعد سید ہبی نزدی "میں نے صاف کہ دیا کہ جناب عالی، حساب پڑھانا اپنے بیس کاروگ ہی نہیں۔ بولے" میاں، کسر نفسی کی حد ہوتی ہے۔ رُٹکیاں تو کہتی ہیں کہ حساب میں تم سے زیادہ لائیں کبھی دیکھا ہی نہیں۔" میں نے لاکھ سمجھا یا مگر وہ نہ مانتے اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

میں پہنچا تو وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ ساجر کی مسکاہت میں سکندر اعظم کی جہلک تھی۔ میں نے بے تکلفی سے کہا "کیوں مجھے حساب کے جھبھٹ میں ڈال رہی ہو تم؟ ایک سوال حل کرنے میں اپنا چھٹا نک بھر ٹوں خشک ہوتا ہے"

اس پر ساجرنے اٹھ کر میرے سامنے دھل کیے ہوئے پرچے رکھ دیے۔ یہ نماہی امتحان کے حساب کے پرچے تھے۔ آپ نے سو میں سے سونہریے تھے اور ساجرنے سو میں سے ۷۸۔ میں حیران رہ گیا۔ ساجر بولی "آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئے" میں نے کہا "تو پھر ٹیکش کا کیا مرطلب؟" ساجر بولی "پڑھ پڑھ کر تھک جاؤ تو کوفت بھی تو مٹانی ہوتی ہے"

پورے دو ماہ ہم تینوں کو فٹ مٹاتے رہے۔ کتابیں سامنے پھیلائیں گے مارتے رہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے بھاپ لیا تھا کہ میں حاجت مند ہوں، اور وہ حاجت روایتی کر رہی تھیں۔ جب ساجر مجھے ماہوار معاو صدر دیتے ہوئے مسکراتی تو میں کہتا "اچھا تو یہ بھاری حرام کی کمائی ہے" اس پر وہ جھٹ بولتی "حلال کی کمائی سے کبھی کوئی ٹوٹا ہو گا ہے کیا؟" دو مہینے کے بعد میرا سادله ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے ان راہ مذاق کہا "کاش کر میں کوئی خدمت کر سکتا" اس پر آپ نے ساجر کو اشارہ کیا۔ ساجر بولی "کہ سکتے ہیں آپ" میں نے پوچھا "وہ کیسے؟" بولی "آپ ہم پر ایک کمائی لکھ سکتے ہیں" ان دو ماہ کے دوران انھیں علم ہو چکا تھا کہ میں افسانے لکھتا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت آپ نے دبی زبان سے کہا "کمائی ضرور لکھیے گا" آپ کی وہ سرگوشی ابھی تک فضای میں تیر رہی ہے۔

آپاچھی تو گویا سلگتی پر تیل پڑ گیا۔ پیشگی شہرت مقصود ہو گئی۔ اس کے باوجود میں نے

اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ عام حقیقتیں کس قدر غیر مالوس ہوتی ہیں۔ اور حقیقت کو جھپانے کے لیے عایمت کا پردہ دیہر ترین پردہ ہے۔ لیکن بقستی سے میں نے اس حقیقت کو صرف جانا، مانا نہیں۔ آج تک یہ حقیقت میرے دل کی گمراہیوں میں نہیں بیٹھ سکی۔ اور آج تک میں انسانے کے لیے ان لوگھے موصوع ڈھونڈتا ہوں۔

آپا چھپی تو شور نقاد اور رفسانہ نویس حسن عسکری نے مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا۔ لکھا تھا ”آپا بہت پسند آئی۔ لیکن ازراہ کرم کسی ساجباجی کا پتا لکھ بھیجیے؟“ میرے اس انسانے پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی تھی۔ حسن عسکری کے اس ایک جملے میں معانی کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ آج بھی جبکہ ساجباجیاں گھر گھر موجود ہیں اور ساجباجی کا پتا پوچھنے کی چند لال ضرورت نہیں، آج بھی حسن عسکری کا وہ جملہ اسی طرح بامعنی ہے۔

انگریزی میں ایک کہادت عام ہے: ”جتنا من پر یغیر بلانڈ نہیں دے سے میری برف نہیں۔“ مطلب یہ کہ شرفانیلی آنکھوں والی خواتین کو پسند کرتے ہیں مگر شادی کالی آنکھوں والی سے کرتے ہیں۔

میرا افسانہ آپا اس کہادت کی ضد تھا۔ میں نے اس انسانے میں یہ کہا کہ شرفا آپا کے مذاع ہوتے ہیں لیکن ساجو سے بیاہ کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن اب مجھے شک ہونے لگا ہے کہ جس تیز زفاری سے ساجباجیاں عام ہوتی جا رہی ہیں، اسے دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید جلد ہی میرے اس انسانے کو پڑھ کر لوگ یہ حسوس کرنے لگیں یا کوئی نقاد مجھے خط میں لکھے کہ ساجباجی بہت پسند آئی، مگر آپا کا پتابتا نہیں۔

حالات کا اُرخ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مستقبل قریب میں آپا ایک خیالی کوادر کی چیزیت اختیار کرے، اور آپا کی محنت کی تفضیلات الٹ لیلے کی باتیں معلوم ہونے لگیں، اور حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آغا قیست کھودے۔ لیکن تابیریخ شاہد ہے کہ کئی ایک بار ساجباجیاں زین کے کئی خطوں پر گھنیبری کی طرح اُگیں۔ مُتّفَاعِدَل کی طرح حلہ اور ہر ہیں، لیکن ہدیشیہ ریسکنڈِ عظم

آنہی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے کسی آن جانے مگر
کے مطابق صدیوں کے بعد ساجباجیوں کا دور آتا ہے، اور صرف اتنی دیر رہتا ہے جتنی دیر
ستارہ لوتا ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اور چھر صدیوں آپائیں راج کرتی ہیں۔ یعنی لوگ
انھیں بے حد پسند کرتے ہیں بلکن ساجباجی کا پتا نپوچھتے چھرتے ہیں۔

ساجباجی ازی محظوظ ہے، اور قدرت ساجباجی کو شاید اس لیے ہم نہیں ہوئے دیتی
کہ مبادا وہ اپنی محبتیت کھود سے اور عورت کی کشش عام ہو کر ختم ہو جاتے۔ نہیں، حن عسکری
کا وہ جملہ اپنی آفاقیت نہیں ہو سکتا۔

میں نے محبت کے موصوع پر کئی افسانے لکھے ہیں۔ میں نے بار بار یہ کہنے کی کوشش
کی ہے کہ محبت کئی ایک روپ دھارتی ہے۔ اور یہی نہیں، کئی بار بات الٹ بھی ہو جاتی
ہے۔ دوسرے جذبے محبت کا سوانگ بھر لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک مرتبہ ایک چڑھا
بھن بھن کرتی ہوئی پروانوں کی عخل میں آدمی۔ بھن بھن کر کے بولی "میں بھی پروان ہوں"۔
اسی طرح کبھی نفرت کا جذبہ بھن بھن کر کے کرتا ہے۔ میں محبت اؤں کبھی استھام کا جذبہ اپنی
تسکین کے لیے محبت کا روپ دھار لیتا ہے۔ کبھی حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ محبت
کا سوانگ بھرے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ کبھی ضرورت محبت ایجاد کر لیتی ہے۔ کبھی پروانوں کی شرارت
محبت کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے۔

ہاں، میں نے محبت پر کئی افسانے لکھے۔ دُور دُور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔
آن جانی باتیں لکھنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ خیال نہ آیا کہ عام محبت کی بات کروں۔ میں کوئی
چھوٹا مٹا نکھاری مخمور سے ہی تھا کہ عام محبت پر افسانہ لکھتا، اور کسی عام کردار نہیں کرتا۔
آپا تو ایک عام کردار تھا۔ اور اس افسانے میں محبت کی عام تفصیلات درج ہیں۔ یقیناً
اگر فرمائش نہ ہوتی تو میں کبھی یہ افسانہ نہ لکھتا۔ لیکن قاری نے آپا پڑھ کر تالیاں بجا گئیں اور
میرے محبت کے دُور سے افسانوں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں الہی خضر

پیدا ہوئی۔ اگر عام پڑھنے والے ایسے عام افسانے پسند کرتے ہیں تو کیا کریں۔ میں کیا عام آدمیوں کے لیے لکھتا ہوں؟

اور بھر آپا۔ آپا کا افسانہ تو غلوص سے خالی ہے۔ یکسر خالی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جو آپا کا مصنفت ہوں، غالق ہوں، میں نے لوگوں کی تیگا ہیں آپا کی طرف منعطف کیں۔ یہ دیکھیے۔ یہ آب دار موڑ دیکھیے۔ اس کی آب و تاب دیکھیے۔ اس کی عظمت کا اندازہ کیجیے۔ لیکن لوگوں کی توجہ آپا کی طرف منعطف کر کے میں خود سا جو باجی کا پتا پوچھتا چرا۔ کسی سا جو باجی کا پتا بتائیے۔ اللہ کسی سا جو کا پتا بتائیے۔ اور پڑھنے والوں نے انسان پڑھ کر کہا۔ آپا خوب ہے۔ بے حد خوب ہے۔ لیکن کسی سا جو باجی کا پتا بتائیے۔“